استاذ امام حمید الدین فراہیؒ کی بلند پایہ علمی تصنیف

'الامعان فی اقسام القران'

کا اردو ترجمہ :

مترجم

مولانا امین احسن اصلاحی

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲ - افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور

(فون ۶۹۲۳۵)

ہدیہ :

اقسام القرآن

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ
کی بے مثال تصنیف امعان فی اقسام القرآن کا اردو ترجمہ

از

مولانا امین احسن اصلاحی

ناشر
مرکزی انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ)
۱۲/ افغانی روڈ۔ سمن آباد۔ لاہور

سال اشاعت	۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء
تعداد	۳۰۰۰
کاتب	عبدالغفور گیلانی
مطبوعہ	اشرف پریس لاہور

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

۱۲۔ افغانی روڈ، سمن آباد۔ لاہور

فون : ۶۸۲۴۵

فہرست

۱۔ تمہید

۲۔ قرآن مجید کی قسموں کے متعلق تین شبہے۔ ۵

۳۔ امام رازیؒ کا جواب۔ ۶

۴۔ علامہ ابن قیمؒ کا مسلک۔ ۱۰

۵۔ اس کتاب کا طریق جواب۔ ۱۲

۶۔ قسم کی ضرورت، اس کی تاریخ، اس کے طریقے اور اس کا ابتدائی مفہوم۔ ۱۴

۷۔ قسم کے لیے مقسم بہ ضروری چیز نہیں: ۱۹

۸۔ قسم کا اصلی مفہوم، جب کہ مقسم بہ موجود ہو۔ ۲۲

۹۔ قسم مقسم بہ یا مخاطب یا متکلم کی تعظیم کے پہلو سے۔ ۲۴

۱۰۔ قسم مقسم بہ کی تقدیس کے پہلو سے۔ ۲۶

۱۱۔ قسم بغرض استدلال۔ ۳۲

۱۲۔ قسم بہ طور استدلال ڈیوس تھینیز کے کلام میں۔ ۳۶

۱۳۔ قسم بہ طور استدلال بولیوس کے کلام میں۔ ۳۸

۱۴۔ استدلالی قسموں میں دلیل کا پہلو۔ ۳۸

۱۵۔ بعض دلائل قرآن مجید سے۔ ۴۰

۱۶۔ صحیح پہلو کے مخفی رہنے کے اسباب۔ ۴۳

۱۷۔ قسم کی بلاغتیں۔ ۴۶

۱۸۔ متحسن اور غیر متحسن قسموں کا بیان ۵۲

۱۹۔ انجیل میں قسم کھانے کی ممانعت اور اس کی توضیح۔ ۵۵

۲۰- پیروان مسیح کے ساتھ ان احکام کے مخصوص ہونے کی حکمت۔ ۵۸
۲۱- بہ لحاظ موقع مستحسن اور غیر مستحسن الفاظ کا فرق۔ ۶۱
۲۲- خاتمۂ کتاب ۶۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سبحان الذی انطق کل شیٔ بانه صنع یده، وغذی رفده، تسبح الشمس لکبریائه و مجده، ویسجد له القمر بجبینه وخده، یتهجد له البر بغوره ونجده، ویحفد الیه البحر بجزره ومده کما قال تعالیٰ فی کتابه، تسبح له السمٰوٰت السبع والارض ومن فیهن وان من شیٔ الا یسبح بحمده، ونصلی علیٰ محمد رسوله المختار وعبده وعلیٰ اٰله وصحبه المعتصمین بحبله وعهده والتابعین لهم علی سواء السبیل وقصده۔

یہ کتاب ان قسموں کے بیان میں ہے جو قرآن مجید میں وارد ہیں۔ ہماری کتاب "تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان" میں جن اصولی چیزوں سے تعرض کیا گیا ہے، ان کے لیے ہم نے ایک علیحدہ مقدمہ[1] لکھا ہے تاکہ کتاب کے پڑھنے والوں پر ان کا بار بار ذکر بار نہ ہو۔ اس رسالے کو اسی مقدمے کا ایک جزو سمجھنا چاہیے۔ اس میں قرآن مجید کی قسموں کے متعلق تمام اصولی مباحث کی تفصیل کی گئی ہے۔ تفسیر میں جہاں جہاں ضرورت ہوگی ان مباحث کا حوالہ دے دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں قسمیں بہت آتی ہیں اور لوگوں کو ان کے مفہوم اور مقصد کے متعلق طرح طرح کے شکوک ہیں۔ تفسیر میں جس میں ہم نے ایجاز و اختصار کی راہ اختیار کی ہے، جگہ جگہ ان قسموں سے تعرض کرنا موجب طوالت اور کتاب کے لیے قرار دادہ مسلک کے بالکل خلاف ہوتا، اس وجہ سے میں نے بہتر سمجھا کہ ایک مختصر رسالے میں اس مسئلے پر ایک اصولی بحث کر دی جائے۔ جزئی تفصیلات اپنے اپنے مواقع میں آتی رہیں گی۔

اس عنوان پر اگلوں میں سے صرف علامہ ابن قیمؒ کی (التبیان) کی مجھے خبر ہے۔ کہیں کہیں امام رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اس سے تعرض کیا ہے۔ مناسب مواقع پر ان دونوں کتابوں کے ضروری مباحث کے حوالے اس کتاب میں ملیں گے۔ واللہ الہادی الی سبیل السلام۔

قرآن مجید کی قسموں کے متعلق تین شبہے

۲۔ اس بحث کا اصل مقصد بعض شبہات کا ازالہ ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ شبہات بیان کر دوں تاکہ کتاب کے

---

[1] یہ مقدمہ دائرہ حمیدیہ نے "فاتحہ تفسیر نظام القرآن" کے نام سے چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔

پڑھنے والے اس اصل مقصد سے بے خبر نہ رہیں جو اس کتاب کے تمام مباحث کا محور و مرکز ہے۔

قرآن مجید کی قسموں پر تین طرح کے شبہے وارد کیے گئے ہیں:۔

ا۔ قسم فی نفسہٖ اللہ تعالیٰ کی شان و عظمت کے بالکل خلاف ہے۔ اپنی بات پر قسم وہ شخص کھاتا ہے جو اپنی ذات کو حقیر سمجھتا ہے اور جس کو بھروسہ نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی بات باور کریں گے۔ قرآن مجید میں خود ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (القلم - ١٠) ہر ذلیل قسم کھانے والے کی بات نہ سنو۔

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قسم کھانا ایک ذلیل عادت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے قسم کھانے کی مطلقاً ممانعت فرمائی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "تمہاری بات ہاں ہاں یا نہیں نہیں ہو قسم مت کھانا"۔

ب۔ قرآن مجید میں قسمیں نہایت اہم امور پر کھائی گئی ہیں مثلاً قیامت، توحید، رسالت اور ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ان امور میں قسم بالکل بے فائدہ چیز ہے۔ نہ اس سے مخالف کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ موافق کو۔ مخالف دلیل و حجت کا طالب ہوتا ہے اور قسم کو دلیل و حجت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور موافق کسی چیز کا بھی طالب نہیں ہوتا، وہ پہلے ہی سے ان حقائق پر ایمان لا چکا ہے جن پر یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔

ج۔ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم الشان اور بلند مرتبہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جو قسم کھائے اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے"۔ (بخاری۔ باب لا تحلفوا بآبائکم) یعنی غیر اللہ کی قسم کی آپ نے ممانعت فرمائی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات کیسے زیبا ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کی قسم کھائے اور وہ بھی انجیر اور زیتون جیسی حقیر چیزوں کی!

یہ تین شبہے ہیں جو عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں امام رازیؒ اور دوسرے متقدمین نے ان شبہات کے جو جواب دیے ہیں ہم پہلے ان کو بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کریں گے جو ان جوابوں کے اندر موجود ہیں۔ کیونکہ کوئی کمزور بات قبول کر لینا دین میں ایک نہایت سخت فتنہ ہے۔ یہی لغزشیں معترضین کو اعتراض اور زبان درازی کی راہ دیتے ہیں لیکن اس تنقید سے ان علماء کی تنقیص مقصود نہیں ہے بلکہ محض حق کو واضح کرنا مقصود ہے۔ ان علماء نے حمایت حق کی راہ میں جو کوشش کی ہے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا صلہ دے اور ہم کو بھی حق کے حامیوں میں بنائے۔

امام رازیؒ کا جواب

٢۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں دوسرے شبہے کا ذکر کر کے سورۂ والصّٰفّٰت کی تفسیر میں اس کا یوں جواب دیا ہے:۔

"جواب کے مختلف پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری سورتوں میں نہایت یقینی دلائل سے توحید، بعث اور قیامت کو ثابت کر دیا ہے۔ چونکہ یہ دلائل گزر چکے ہیں اور ان کا بیان ابھی ذہنوں سے زیادہ دور نہیں ہوا تھا۔ اس لیے دلائل سے قطع نظر کر کے بطور تاکید قسم کو ذکر کیا اور یہاں خصوصیت کے ساتھ یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ قرآن عربی زبان میں اترا ہے اور کسی دعوے کو قسم کے ذریعے سے ثابت کرنا اہل عرب کا معروف طریقہ ہے"۔

یہ اخیر والی بات یعنی قسم کے ذریعے سے اپنے دعوے کو ثابت کرنا عربوں میں مشہور و معروف ہونا پہلے شبہے کا بھی جواب ہے۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم سے پہلے چونکہ دلائل بیان ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے اصل اعتماد ان دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ قسم پر۔ قسم محض تاکید کے لیے ہوتی ہے۔ جیسا کہ عربوں کی عادت ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں ہے، خود قرآن مجید سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دلائل کی وضاحت کے بعد جتنی قسمیں آئی ہیں ان سے کہیں زیادہ وحی کے ابتدائی زمانہ میں پائی جاتی ہیں۔

آگے امام رازیؒ کے جواب کی تقریر یوں ہے۔

"پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے قول اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (بے شک تمہارا معبود ایک ہی ہے) کی صحت پر ان چیزوں کی قسم کھائی۔ پھر اس کے بعد وہ بات بیان کی جو اللہ کے ایک ہونے کی یقینی دلیل ہے، یعنی رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ "(آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور مطالع کا رب ہے) اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" (اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا بہت سے معبود ہوتے تو ان کا کارخانہ درہم برہم ہو جاتا) میں یہ بات بیان فرما دی ہے کہ آسمان و زمین کا انتظام قائم رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ ایک ہے۔ پس یہاں جب فرمایا کہ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ" تو اس کے بعد فرمایا "رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ" گویا پوری بات یوں ہوئی کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس عالم کے انتظام میں غور کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ ایک ہے۔ پس اس دلیل پر غور کرو تاکہ تمہیں توحید کا علم حاصل ہو"۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم کے بعد ایک ایسا قول لایا گیا ہے جس میں دلیل موجود ہے۔ پس اصل استدلال اس قول سے ہے نہ کہ قسم سے۔ قسم محض تنبیہ و تاکید کے لیے آئی ہے۔ یہ جواب پہلے جواب سے بالکل ملتا جلتا ہوا ہے اور ان میں سے کسی جواب سے بھی قسم کی ان مختلف قسموں کی حکمت نہیں واضح ہوتی جو قرآن مجید میں وارد ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کی قسم چھوڑ کر ان چھوٹی چھوٹی مخلوقات کی قسم کیوں کھائی گئی۔

آگے امام رازیؒ جواب کی تقریر یوں فرماتے ہیں۔

"جواب کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس کلام سے مقصود بت پرستوں کے اس قول کی تردید ہے کہ یہ بت خدا ہیں۔ پس اس کی تردید میں گویا یوں کہا گیا ہے کہ یہ مذہب اپنی رکاکت اور لغویت کے اعتبار سے ایسا ناقابل توجہ ہے کہ اس کی تردید کے لیے بس اس طرح کی دلیل کافی ہے۔ واللہ اعلم"۔

حضرت امام رازیؒ کا یہ جواب نہایت کمزور ہے جواب کے پہلے دو پہلو بیان کرتے ہوئے گویا انھوں نے اعتراف کر لیا کہ قسم میں دلیل کا کوئی پہلو نہیں ہے اور پھر آخر میں یہ فرما دیا کہ حریف کا مذہب ہی اس قابل تھا کہ اس کی تردید میں یہ غیر استدلالی اسلوب اختیار کیا جائے۔

اس کے علاوہ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں بھی انھوں نے ان شبہات سے کسی قدر تعرض کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"قسم کی حکمت دراں حالیکہ وہ نہایت بلند اور عظیم الشان مطالب و مسائل میں سے ہے، تفسیر سورۂ والصّٰفّٰت میں ہم بیان کر چکے ہیں اور یہاں بھی ہم اس کو بیان کیے دیتے ہیں۔ اس میں چند پہلو ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ کفار بعض اوقات اعتراف کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دلیلیں قائم کرنے میں ان سے زیادہ زوردار ہیں لیکن اس زور کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت مناظرہ کا نتیجہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ خود اپنے قول کی غلطی سے واقف ہیں لیکن محض اپنے مناظرہ کے زور سے (نہ کہ سچائی کے زور سے) ہم پر غالب آجاتے ہیں۔ یہ اس طرح کی بات تھی جیسی کہ عام طور پر بحث میں ہار جانے والے اپنے حریف کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ یہ شخص محض اپنے زور بیان سے ہم پر غالب ہو گیا ہے اور ہم اس چیز سے محروم ہیں ورنہ وہ خود جانتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ ہے۔ ایسی صورت میں دلیل قائم کرنے والے کے لیے قسم کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ وہ جواب دیتا ہے کہ حق بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے کوئی مناظرہ نہیں کر رہا ہوں۔ اگر وہ یہ طریقہ نہ اختیار کرے بلکہ دوسری دلیل بیان کرنی شروع کردے تو وہ اس دلیل کے ختم ہونے کے بعد بھی وہ وہی کہے گا کہ یہ دلیل بھی محض قوت مناظرہ کا کرشمہ ہے۔ پس خاموشی یا قسم اور ترک دلیل ہی کی راہ اس صورت میں کچھ مفید ہو سکتی ہے۔"

یہ جواب اولاً تو صحیح اور غلط دونوں طرح کی باتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ثانیاً اس جواب سے مصنف نے اپنے اس جواب کی خود تردید کردی جو تفسیر سورۂ والصّٰفّٰت میں دیا تھا۔ وہاں جواب کے دوسرے پہلو کی تقریر کرتے ہوئے مصنف نے بتایا یہ ہے کہ قسم کے بعد دلیل آتی ہے اور وہی چیز اصل ہوا کرتی ہے۔ قسم کا مقصود محض تاکید ہوتا ہے۔ یہ بات اپنے اندر ایک حقیقت رکھتی ہے کیونکہ قرآن مجید میں کہیں بھی کلام قسم پر ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے بعد کچھ اور بات بھی کہی گئی ہے لیکن یہاں انھوں نے ایک بالکل دوسری ہی بات کہہ دی ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہ کہتے کہ بعض اوقات مخاطب طریق استدلال سے ناواقفیت یا اپنے فکر و نظر پر عدم اعتماد یا متکلم کی سحر بیانی کے اندیشے کے سبب سے دلیل سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور ایسی حالت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ دلیل قسم کے ساتھ پیش کی جائے تو یہ ایک لگتی ہوئی بات ہوتی۔

اس کے بعد وہ جواب کے دوسرے پہلو کی تقریر یوں کرتے ہیں:۔

"دوسرا یہ ہے کہ عرب جھوٹی قسم سے بہت ڈرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے سبب سے طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، اس کے اثر بد سے زمین ویران اور بنجر ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بیشتر نہایت اعلیٰ و اشرف چیزوں کی قسم کھاتے تھے۔ اس وجہ سے عربوں کو خیال ہوتا تھا کہ اگر یہ قسمیں جھوٹی ہوتیں تو اس کا وبال ضرور آپ پر نازل ہوتا اور ان کی نحوست سے آپ ہرگز نہ بچ سکتے۔"

اس جواب میں امام رازیؒ نے عربوں میں قسم کے ایک متعارف چیز ہونے کی طرف جو اشارہ کیا ہے جیسا کہ اوپر گزر رہا ہے۔ بالکل صحیح ہے لیکن اس میں انھوں نے یہ جو اضافہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیشتر اشرف و اعلیٰ چیزوں کی جھوٹی قسم کھانا موجب وبال سمجھتے تھے حالانکہ بوجوہ ذیل یہ بات کچھ قوی نہیں معلوم ہوتی۔

۱۔ قرآن مجید میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان میں بہتیری ایسی ہیں جن میں بظاہر کوئی شرف نہیں معلوم ہوتا۔

۲۔ قرآن سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ خدا کے سوا کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیے۔

۳۔ انجیر اور زیتون وغیرہ کی قسم سے کس وبال کا اندیشہ ہو سکتا ہے؟

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی تبلیغ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرماتے تھے۔ پس قسمیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کو کسی سے بھی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

اگر امام رازیؒ صرف جواب کے پہلے حصے پر قناعت کرتے اور اتنا ہی فرماتے کہ عرب جھوٹی قسم کے وبال سے بہت ڈرتے تھے اور یہ سمجھ کر کہ شریف آدمی کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائے گا۔ اس کی بات کا احترام کرتے تھے تو پہلے اور دوسرے شبہے کا اس سے ایک کمزور سا جواب نکل آتا لیکن ان کی بعد کی تقریر تو بالکل ہی بے معنی ہو گئی ہے۔

اس کے بعد جواب کے تیسرے پہلو کی تقریر وہ یوں فرماتے ہیں:۔

"تیسرا پہلو یہ ہے کہ تمام قسمیں جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں وہ دراصل دلائل ہیں لیکن ان کو پیش قسم کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھو کہ جیسے کوئی شخص اپنے محسن سے کہے کہ تمھارے بے شمار احسانات کے حق کی قسم میں تمھارا شکر گزار ہوں، اس میں اس کے بے پایاں انعامات کا ذکر دوام شکر کا سبب ہے، البتہ اسلوب قسم کا ہے۔ یہی صورت یہاں ہے (سورۂ ذاریات کی قسموں کی طرف اشارہ ہے) یہ تمام چیزیں اس امر پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کو قسم کی صورت میں کیوں پیش کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی بات قسم سے شروع کرتا ہے تو مخاطب کو خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی اہم بات کہنے والا ہے اس کو خاص اہتمام سے سنتا ہے پس اسی اصول پر یہاں بھی کلام کا آغاز قسم سے ہوا ہے اور دلیل قسم کے لباس میں پیش کی گئی ہے۔"

یہ تقریر دوسرے شبہے کے جواب کے لیے اگرچہ کافی ہے لیکن جو شخص اس بات کا قائل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ قسم کا مقسم علیہ پر دلیل ہونا ثابت کرے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر چند کہ بعض مقامات میں واضح ہے، لیکن بیشتر نہایت شدید غور و فکر اور حجت و استدلال کی محتاج ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ امام رازیؒ نے اسی اصول پر سورۂ ذاریات اور بعض خاص سورتوں کے سوا کہیں اعتماد نہیں کیا ہے، عام طور پر وہ دو طریقے اختیار کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے قسم کے ہونے ہی سے انکار کر دیتے ہیں کہ نہ قسم مانیں گے نہ شبہات و اعتراضات کے تیروں سے مجروح ہوں گے۔ چنانچہ سورہ قیامہ کی تفسیر میں انھوں نے یہی مسلک اختیار فرمایا ہے، سورہ کے پہلے لفظ "لا" (نہیں) کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"دوسرا احتمال یہ ہے کہ "لا" یہاں قسم کی نفی کے لیے ہو۔ گویا یوں فرمایا کہ میں اس دن اور اس نفس کی قسم نہیں کھاتا بلکہ بغیر قسم کھائے تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمھارا گمان ہے کہ تمھارے سڑ گل جانے کے بعد ہم تمھاری ہڈیاں جمع نہیں کر سکتے اور اگر تمھارا یہ گمان ہو تو یاد رکھو کہ ہم قادر ہیں کہ ایسا کر دیں۔ یہی قول ابو مسلم نے اختیار کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔"

امام رازیؒ کی اس رائے کو عربی زبان کا کوئی جاننے والا کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگر یہی بات ہوتی جو انھوں نے سمجھی ہے تو اس کو ایسے اسلوب سے ہونا تھا جس میں مطلق قسم کی نفی ہوتی۔ اس کو خاص خاص چیزوں مثلاً یوم قیامت، نفس لوامہ، خنس، جواری کنس وغیرہ کے ساتھ مقید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ بات عربی اسلوب کلام کے بھی خلاف ہے۔ عرب قسم سے پہلے

حرف "لا" استعمال کرتے ہیں اور وہ منقطع یعنی کلام مابعد سے الگ ہوتا ہے۔ تفسیر سورۂ قیامہ میں ہم اس کو بالتفصیل بیان کر چکے ہیں اور یہی زمخشری کا مذہب ہے۔

امام رازیؒ کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ قسم کو مقسم بہ کی عظمت و شرافت کے لیے ایک طرح کی تاکید و تنبیہ سمجھتے ہیں۔ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں انھوں نے فرمایا ہے کہ "قسم سے مقصود مقسم بہ کی عظمت و جلالت پر تنبیہ کرنا ہوتا ہے" یہی اصول انھوں نے سورۂ تین کی تفسیر میں بھی اختیار فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"یہاں ایک اہم اشکال یہ ہے کہ تین اور زیتون کا شمار بلند اور اشراف چیزوں میں نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے لیے کیسے زیبا ہے کہ وہ ان چیزوں کی قسم کھائے۔ اس سوال کے جواب میں دو قول ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے تین و زیتون کے پہلے عام معنی فرض کر کے انجیر اور زیتون کے فوائد پر تقریر کی ہے اور اس کے بعد اس مفروضہ پر کہ ان سے دو مسجدیں یا دو مخصوص مقام مراد ہیں۔ ان دو مسجدوں اور مقامات کے عظمت و تقدس کو واضح کیا ہے۔ لیکن اولاً تو اس جواب کا ضعف مخفی نہیں۔ ثانیاً اس سے تیسرے شبہے کا کسی طرح ازالہ نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں جن کی قرآن مجید نے قسم کھائی ہے اور جن میں ہانپنے والے گھوڑے، دبک جانے والے تارے، شب، صبح، انجیر، زیتون وغیرہ سب ہی قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ کسی صورت میں بھی یہ مرتبہ نہیں رکھتی ہیں (اگر کسی چیز کی قسم اس کے مرتبہ و عظمت کی وجہ سے کھائی جاتی ہے) کہ ان کا پیدا کرنے والا اور ان کا پالنے والا ان کی قسم کھائے۔

علامہ ابن قیمؒ رحمہ اللہ کا مسلک

۴۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اعتراض و جواب کا طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ کہ پہلے شبہات وارد کریں اور پھر ان کے جواب دیں۔ انھوں نے قسم کی حکمت سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں ایسی باتیں بیان فرمائی ہیں جن سے شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور اعتراضات کی جڑ کٹتی ہے۔ جہاں تک ان کے اصلی جواب کا تعلق ہے میں اس کو ٹھیک سمجھتا ہوں۔ لیکن امام رازیؒ کی طرح وہ بھی اس جواب پر پوری طرح مطمئن نہیں ہیں بلکہ مذبذب اور متردد ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں جہاں قسم والی سورتوں کی تفسیر شروع کرتے ہیں کسی ایک اصول کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے۔ کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں کبھی کچھ۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے جواب کا خلاصہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دوں اور اپنے طریقے کے مطابق اس میں جو کمزوریاں ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کر دوں۔

علامہ ابن قیمؒ کے متعلق پہلی بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ انھوں نے استقرار کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی پہلے اس امر کو ثابت کیا ہے کہ قرآن میں جتنی قسمیں ہیں سب اللہ کی، اس کی صفات کی اور اس کی آیات کی قسمیں ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ بعض چیزوں کی بعض چیزوں پر قسمیں کھاتا ہے اور اس کی قسمیں اپنی ذات کی ہوا کرتی ہیں جو خاص صفات سے متصف ہے یا ان نشانیوں کی جو اس کی ذات و صفات کو مستلزم ہیں اور یہ جو کہیں کہیں بعض مخلوقات کی قسم کھائی ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ہے۔"

چند مثالیں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

"اس امر کو سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایمان کی ان اصولی باتوں پر قسم کھاتا ہے جن کی معرفت خلق پر واجب ہے۔ چنانچہ کبھی توحید پر قسم کھاتا ہے، کبھی قرآن کے حق ہونے پر، کبھی رسول کی صداقت پر کبھی جزا اور وعدہ وعید کے وقوع پر اور کبھی انسان کے حال و مآل پر۔"

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن قیمؒ کے نزدیک تمام قسمیں تین چیزوں پر منحصر ہیں اور ان تین کا محور بھی جیسا کہ ابھی خود ان کے بیان سے واضح ہو جائے گا۔ ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات۔

اس تمہید کے بعد علامہ ابن قیمؒ کو جواب قسم کے بارے میں کھوج کرید کی کچھ ایسی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ ان کے نزدیک مقسم علیہ معلوم و متعین ہے، یعنی توحید، نبوت، قیامت اور قسم خود بخود ان پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ وہ سورۂ عادیات اور سورۂ والعصر کی قسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہاں جواب قسم حذف کر دیا گیا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ انھیں تین امور (توحید، نبوت، قیامت) پر قسم کھائی جاتی ہے اور یہ تینوں باہم دگر، لازم و ملزوم ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ رسول حق ہے تو قرآن اور معاد بھی ثابت ہو گیا اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن حق ہے تو اس رسول کی صداقت اور اس کتاب کی صداقت بھی ثابت ہو گئی جس میں وعدہ وعید کا حق ہونا ثابت ہو گیا تو رسول کی صداقت اور اس کی کتاب کی صداقت بھی ثابت ہو گئی جس میں وعدہ و وعید وارد ہے۔ اور جواب کبھی حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کا ذکر مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ وہاں محض مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ یہ قسم کھانے کے لائق چیزوں میں سے ہے۔"

پس یہ تمام قسمیں علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات پر دلیل ہیں۔ چنانچہ وہ سورۂ بروج کی قسم کی نسبت فرماتے ہیں:-

"یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں اور اس کی وحدانیت کے دلائل ہیں۔"

پھر فرماتے ہیں:-

"اور اولیٰ یہی ہے کہ یہ قسم جواب سے مستغنی ہو کیونکہ یہاں مقصود مقسم بہ پر متنبہ کرنا اور یہ بتانا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نشانیوں میں سے ہے۔"

یہی بات سورہ طارق کی قسم کی بابت فرماتے ہیں:-

اللہ تعالیٰ نے آسمان اور اس کے روشن ستاروں کی قسم کھائی اور ان میں سے ہر ایک اس کی توحید کی نشانیوں میں سے ہے۔"

اس سورہ کے وسط کی قسم کی بابت فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ نے بارش والے آسمان اور نباتات سے معمور زمین کی قسم کھائی اور ان میں سے ہر ایک اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو اس کی پروردگاری پر دلیل ہے۔"

سورہ انشقاق کے اخیر کی قسم کی بابت فرماتے ہیں:-

"یہ (یعنی شفق، لیل اور قمر) اور اس طرح کی تمام چیزیں نشانیاں ہیں جو خدا کی ربوبیت پر دلیل ہیں اور اس کے صفات کمال کے علم کو مستلزم ہیں۔"

اس قسم کے جواب کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"جائز ہے کہ یہ اس قسم میں سے ہو جس کا جواب محذوف ہوا کرتا ہے۔"

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ علامہ ابن قیمؒ کو جواب قسم کے لیے کچھ ایسی کد نہیں ہے۔ کیونکہ مقسم علیہ ان کے نزدیک بالکل معلوم و متعین ہے۔ اس تفصیل کے بعد امام رازیؒ اور علامہ ابن قیمؒ کے نقطہ نظر کا فرق بالکل واضح ہو گیا۔ امام رازیؒ مختلف جوابات کی طرف اشارے کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ جواب باہمدگر متناقض ہوتے ہیں لیکن علامہ ابن قیمؒ نے ایک متعین راہ اختیار کی ہے اور وہ تمام قسموں کی تاویل میں اسی ایک راہ پر چلتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ بہتر ہے۔

اب ہم علامہ ابن قیمؒ کے طریق جواب کا لب لباب سامنے رکھے دیتے ہیں۔ ان کے پیش نظر دو بنیادی اصول ہیں:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قسمیں اپنی ذات اور اپنی نشانیوں کی کھائی ہیں، جہاں کہیں مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم کھائی ہے تو وہ بھی اصلاً اس کی ذات ہی کی قسم ہے کیونکہ وہ چیز بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے۔

اس سے انھوں نے اس تیسرے شبہے کا ازالہ کرنا چاہا ہے جو کسی مخلوق کی اس کے رتبے سے زیادہ تعظیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ شبہ اس کے بعد بھی علی حالہ قائم رہتا ہے کیونکہ قسم کا تعلق تو بہر حال ایک مخلوق شے سے ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی صفات کے دلائل میں سے ہونا اس کو مقسم بہ ہونے سے خارج نہیں کر سکتا۔

علاوہ ازیں ان کا یہ فرمانا کہ:۔

"جواب قسم کبھی حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کا ذکر مقصود نہیں ہوتا بلکہ مقسم بہ کی تعظیم اور یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ قسم کھانے کی چیزوں میں سے ہے۔"

اس امر کی صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات برتر کے علاوہ اور چیزوں کی بھی قسم کھائی ہے اور اس سے اس کا مقصود اپنی بعض مخلوقات کی تعظیم ہے۔ اس کا خلاصہ یقیناً یہی نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بعض چیزوں کی قسم کھانا ان کی عزت و شرف کے پہلو سے ہے۔

اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ اپنی بعض مخلوقات کو عزت و شرف سے نوازے۔ اس پر بھی کوئی اعتراض یا شبہ نہیں ہے کہ بعض چیزیں اشرف و برتر ہوں ہیں۔ اعتبارات کے تغیر و تبدل سے کتنی حقیر چیزیں اشرف و اعلیٰ اور کتنی اشرف چیزیں حقیر و ادنیٰ ہو سکتی ہیں۔ شبہ اس امر میں ہے کہ کسی شے کو عزت و بلندی کا وہ مقام حاصل ہو جائے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اس کی قسم کھائے۔

۲۔ دوسرا اصول جس پر علامہ ابن قیمؒ نے اعتماد کیا ہے یہ ہے کہ تمام قسمیں مقسم علیہ پر دلیل ہیں۔ اس سے انھوں نے تیسرے شبہے کا ازالہ کرنا چاہا ہے۔ یہ اصول امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی ہے لیکن یہ ان کے ترکش کے بہت سے تیروں میں سے ایک ہے۔ جس کو استعمال کرنے سے وہ جھجکتے بھی ہیں۔ لیکن علامہ ابن قیمؒ کا یہ حال نہیں ہے۔ وہ اسی اصول پر پورا اعتماد

رکھتے ہیں اور اکثر آیات قسم کی انھوں نے ایسے طریق پر تاویل و تفسیر کی ہے جس سے مقسم بہ کی دلالت مقسم علیہ پر واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ جہاں کہیں ان کو اشکال پیش آیا ہے وہاں انھوں نے مقسم علیہ کو محذوف قرار دے کر قسم کو صفات الٰہی پر دلیل قرار دے دیا ہے۔

باوجود اس ضعف کے جو ان کے جواب میں موجود ہے۔ اور باوجود ان کی اس تصریح کے کہ کبھی کبھی قسم مقسم بہ کی تعظیم کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے قابل قدر لکھا ہے اور ان کی کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات ایسے ہیں جن میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تیر نشانے پر پہنچا ہے۔

اس کتاب کا طریق جواب

۵۔ اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس مسئلہ میں ہمارے نزدیک صحیح مذہب ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ قسمیں دلیل ہیں۔ لیکن اگر ایک طرف یہ حضرات اپنے سامنے یہ روشنی رکھتے ہیں تو دوسری طرف اس شبہے میں بھی گرفتار ہیں کہ قسم میں مقسم بہ کی تعظیم کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ ظن باطل ہے جو قرآن کی قسموں کے باب میں درحقیقت تمام شبہات کا سرچشمہ بن گیا ہے۔ پس پہلے ہم اس ظن باطل کی تردید کریں گے تاکہ واضح ہو جائے کہ قسم کو مقسم بہ کی تعظیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تعظیم محض بعض قسموں سے سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم اس امر کی تصریح کریں گے کہ مخلوقات کی قسمیں تمام تر از قبیل دلائل ہیں اور قسموں کی یہ قسم تعظیمی اقسام سے بالکل علیحدہ ہے۔ نیز یہ صفات الٰہی کی قسم بھی نہیں ہے جیسا علامہ ابن قیمؒ نے لکھ دیا ہے۔

اس کے بعد ہم قسم کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ مواقع کی تفصیل بیان کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ قسم کی مطلق ممانعت کا خیال صحیح نہیں ہے۔

یہ تین امور ہیں جو اس کتاب میں بحث و نظر کے محور ہوں گے اور چوں کہ ان کو پوری طرح روشنی میں لانے کے لیے بعض تفصیلات ناگزیر ہیں اس لیے مجبوراً ہم کو قسم کی تاریخ، قدیم و جدید زمانے میں اس کی ضرورت اور اس کے مختلف انواع و اقسام سے بھی تعرض کرنا پڑے گا اور اسی ضمن میں ہم کو کلمات قسم کے معانی، قسم کے اصل مفہوم اور اس کے تین ضمنی مفہوم یعنی اکرام تقدیس اور استدلال وغیرہ سے بھی بحث کرنی ہو گی۔

پھر قسموں کی تاویل میں خود قرآن سے نہایت واضح دلیل پیش کریں گے اور اپنے پیشرو علماء کے عذر کو واضح کرنے کے لیے اس بات پر بھی بحث کریں گے کہ یہ حقیقت اس قدر واضح ہونے کے باوجود اب تک مخفی کیوں رہی۔

علاوہ ازیں اسی سلسلے میں اقسام القرآن کی بلاغت، قسم کی ممانعت، اس کے جواز اور اس کے استحسان کے پہلو، حضرت مسیح کی ممانعت قسم کے وجوہ وغیرہ امور بھی روشنی میں آئیں گے اور آخر میں ایک سرسری اشارہ ہم اس امر کی طرف بھی کریں گے کہ قرآن مجید نے الفاظ قسم کے فرق و امتیاز میں کس بلاغت کو ملحوظ رکھا ہے۔ تاکہ ہم الفاظ قسم کے محل و موقع کو پہچان سکیں۔

یہ مطالب کتاب کا ایک اجمالی بیان تھا۔ اب ہم ان کی تفصیل و تشریح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ واللہ الموفق و نعم الوکیل۔

قسم کی ضرورت، اس کی تاریخ، اس کے طریقے اور اس کا اصلی ابتدائی مفہوم

۶- بعض اوقات آدمی اپنے مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کسی بیان یا وعدے کو زور اور تاکید کے ساتھ پیش کرے۔ خصوصیت کے ساتھ اہم قومی و اجتماعی معاملات میں ایسا کرنا بسا اوقات ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ، یا ایک بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ، یا عام افراد آپس میں کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو باہمی اعتماد و اطمینان کے لیے اس طرح کی تاکید و توثیق ضروری سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چیز موافق کو مخالف اور دوست کو دشمن سے پہچاننے کا معیار قرار پا جاتی ہے۔

انسان کی اس تمدنی ضرورت نے طرح طرح کے طریقے اور خاص خاص الفاظ پیدا کر دیے جن سے لوگ اس تاکید کا اظہار کرنے لگے۔ یہ قسم کی اصل ہوئی۔

رومیوں، عربوں اور عبرانیوں کے حالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات اس تاکید کا اظہار داہنا ہاتھ پکڑ کر کرتے تھے۔ جب معاہدے کے وقت ایک فریق دوسرے فریق کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا تو یہ فریقین کی طرف سے معاہدے کی پختگی اور مضبوطی کے ساتھ اس کی پابندی کا اظہار و اقرار ہوتا۔ گویا یہ ہیئت ان کی طرف سے اس امر کا اعلان سمجھی جاتی کہ ہمارا تعلق محکم ہے اور اس کی ضمانت کے طور پر ہمارے داہنے ہاتھ گرو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قسم کے لیے یمین کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی عربی زبان میں داہنے ہاتھ کے ہیں۔ بعض شاعروں نے قسم کی اس حقیقت کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مثلاً جاس کا شعر ہے:

ساددی حق جادی ویدی رھن فعالی

میں اپنے پڑوسی کا حق ادا کروں گا اور میرے ہاتھ میرے کارناموں کے بدلے رہن ہیں

یہیں سے قسم میں کفالت و ضمانت کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ اس چیز کو ہر صاحب نظر جانتا ہے۔ بیعت کے وقت داہنا ہاتھ تھمانا یا بیع و شرا کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارنا اسی حقیقت کی ایک عملی تصویر ہے۔ رومیوں اور ہندوستان کی قوموں میں اس کی یادگار موجود ہے۔ عبرانی بھی قسم کو یمین کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

زبور باب ۱۴۴ - ۸ میں ہے:

"جن کے منہ سے بطالت نکلتی رہتی ہے اور جن کی قسم جھوٹی قسم ہوتی ہے۔"

عبرانی میں یہ عبارت یوں ہے:

"اشر فیہم دبر سوء بیمینام یمین سوء۔"

لیکن انگریزی مترجموں پر تعجب ہے کہ اس عبارت کا مطلب وہ نہ سمجھ سکے اور دوسرے فقرے کا ترجمہ انھوں نے یوں کر دیا۔ انھوں نے یمین کے لفظ سے قسم نہیں سمجھی بلکہ سچ مچ داہنا ہاتھ سمجھ لیا اور یہ ان کی بے شمار غلطیوں میں سے ایک نہایت بھونڈی غلطی اور عبرانی سے ان کی ناواقفیت کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے۔

اور اس غلطی سے زیادہ انوکھی اور عجیب بات یہ ہے کہ انھوں نے بعد میں اس ترجمے پر نظر ثانی کر کے اس میں بہت کچھ

رد و بدل کیا۔ لیکن کیا یہ غلطی جوں کی توں رہ گئی۔

اسی طرح معاملے کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارنے کا ذکر امثال سلیمان ۶: ۱ میں ہے۔

"اگر تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر کسی بیگانے کا ذمہ دار ہوا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ عہد و معاملے کے بارے میں عربوں اور عبرانیوں کا حال بہت کچھ یکساں ہے۔ اسی طرح 'یمین' کا لفظ جس طرح ہمارے ہاں قسم کے لیے برتا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں بھی قسم کے لیے برتا گیا ہے۔

جب عہد میں شریک ہونے والے بہت سے لوگ ہوتے تو ایسا بھی ہوتا کہ پانی سے بھرے ہوئے کسی برتن میں سب اپنے داہنے ہاتھ ڈالتے اور چونکہ برتن کی چیز سے سب کے ہاتھ مس ہوتے اس لیے اس کے معنی یہ سمجھے جاتے کہ گویا سب نے ایک دوسرے کا داہنا ہاتھ پکڑ کر کسی بات پر اتفاق کیا ہے اور چونکہ چھونے اور لگنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں چیز پانی ہے۔ اس لیے عربی میں بلت یا لشی میدی لصقت بہ (میرا ہاتھ اس شے پر جم گیا) کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ طرفہ کا مشہور شعر ہے۔

اذا ابتدر القوم السلاح وجدتنی منیعا اذا بلت بقائمہ یدی

جب قوم کے لوگ اسلحہ کی طرف جھپٹتے ہیں تو مجھے اس وقت محفوظ دیکھے گا جب میرے ہاتھ تلوار کے قبضہ پر جم جاتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی خوشبو لے کر باہم تقسیم کرتے اور اس کو ہاتھوں میں مل لیتے اور چونکہ خوشبو پانی کے مقابلے میں زیادہ دیرپا، زیادہ پھیلنے والی اور زیادہ اعلان کرنے والی ہوتی ہے اس لیے اس کو 'عرف' اور 'نشر' بھی کہنے لگے۔ اس قسم کے معاہدے کی مثال ہم کو عربی لٹریچر میں "عطر منشم" کے قصے میں ملتی ہے، جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک قوم نے اپنے دشمنوں سے لڑائی کی ٹھانی اور اس کے لیے معاہدہ کیا اور اس معاہدہ کی صورت یہ ہوئی کہ ایک عطر فروش عورت "منشم نامی" سے خوشبو خریدی گئی اور اس کو باہم تقسیم کیا گیا۔ اس معاہدے کا قصہ مشہور ہے۔ یہاں تک کہ عربی لٹریچر میں اس کا ذکر بطور ضرب المثل کے ہوتا ہے۔ زہیر اپنے ایک شعر میں کہتا ہے۔

تدارکتما عبسا و ذبیان بعد ما

تفانوا و دقوا بینھم عطر منشم

تم دونوں نے عبس اور ذبیان کو اس وقت سنبھالا جب وہ آپس میں لڑ کے فنا ہو چکے تھے اور منشم کا عطر تقسیم کیا تھا۔

اسی سے ملتی جلتی شکل خوشبو میں ہاتھ ڈبونے کی بھی ہے جس کے متعلق مطیبین کے حلف کا واقعہ ہم دسویں فصل میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

بعض مرتبہ کوئی چوپایہ ذبح کر کے اس کا خون معاہدے کے دونوں فریق اپنے جسموں پر چھڑکتے۔ اس کا مطلب یا تو یہ سمجھا جاتا کہ یہ دوستی رشتہ خون و قرابت کے درجے کی ہے یا یہ کہ اس عہد کی حفاظت کی راہ میں ہم اپنا خون تک بہا دیں گے خروج باب ۲۴: ۵ سے ۸ میں ہے:

"اور اس نے بنی اسرائیل کے جوانوں کو بھیجا جنھوں نے سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور بیلوں کو ذبح کر کے سلامتی کے ذبیحے خداوند کے لیے گزرانے ۵ اور موسیٰ نے آدھا خون لے کر باسنوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑک دیا ۶ پھر اس نے

عہد نامہ لیا اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ خداوند نے فرمایا ہے۔ اس سب کو ہم کریں گے اور تابع رہیں گے۔" تب موسیٰ نے اس خون کو لے کر لوگوں پر چھڑکا اور کہا کہ دیکھو یہ اس عہد کا خون ہے جو خداوند نے ان سب باتوں کے بارے میں تمھارے ساتھ باندھا ہے۔"

اس قسم پر غور کرو، معاہدے کے لیے ایک طرف تو انھوں نے اپنے جسموں پر خون چھڑکا، دوسری طرف مذبح پر چھڑکا جو گویا خدا کا قائم مقام تھا اور اس طرح خداوند کے حلیف ہوئے۔ توراۃ میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ زکریا ب ۹-۱۲ امیں ہے:۔

"اور تیری بابت یوں ہے کہ تیرے عہد کے خون کے سبب سے میں تیرے اسیروں کو اندھے کنویں سے نکال لایا۔"

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنی رسی ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے اور اس طرح باہم حلیف بن جاتے۔ چنانچہ لفظ حبل ذمہ اور جوار کے معنی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ قرآن مجید میں ہے:۔

اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ	مگر اللہ کے عہد و پیمان کے ذریعے سے اور لوگوں کے
الآیۃ (آل عمران - ۱۱۲)	عہد و پیمان کے ذریعے سے۔

امراء القیس کا شعر ہے:۔

انی بحبلك واصل حبلی
وبریش نبلك واصل نبلی

میں تیری رسی کے ساتھ اپنی رسی جوڑوں گا اور تیرے تیر کے پر کے ساتھ اپنا تیر لگاؤں گا۔

حطیئہ نے اپنے ایک شعر میں اس کی اصل حقیقت بے نقاب کر دی ہے۔

قوم یبیت قریر العین جارهم
اذا لوی بقوی اطنابهم طنبا

ایسے لوگ ہیں کہ ان کا پڑوسی چین کے ساتھ سوتا ہے جب کہ ان کی رسی کے ساتھ اپنی رسی جوڑ لیتا ہے۔

غرض فریقین میں جو معاہدے ہوتے عموماً اس کی تاکید و توثیق کے یہ طریقے رائج تھے۔ بسا اوقات کوئی لذت اپنے اوپر اس قصد سے حرام کر لیتے کہ جب تک فلاں کام پورا نہ کر لیں گے اس وقت تک اس سے متمتع نہ ہوں گے اس کو نذر کہتے تھے۔ اس قسم کی مشہور نذر کلیب کے بھائی مہلہل کی نذر تھی۔ جس نے نذر مانی تھی کہ جب تک اپنے بھائی کا قصاص نہ لے گا اس وقت تک نہ تو شراب پیئے گا نہ خوشبو لگائے گا۔ نہ بالوں میں کنگھی کرے گا۔ ایسا ہی ایک موقع پر امراء القیس نے بھی کیا تھا۔ چنانچہ نذر پوری ہونے کے بعد اس نے کہا۔

حلت لی الخمر وکنت امرأ
عن شربها فی شغل شاغل

اب میرے لیے شراب حلال ہوئی اور میں ایسا شخص تھا جس کو ایک بڑی مہم نے اس کے پینے سے روک رکھا تھا۔

بعد میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر اس بات کو نذر کہنے لگے جس کا بطریق قسم التزام کر لیا جائے، چنانچہ

عمرو بن معدیکرب کہتا ہے:۔

هم ینذرون دمی وانذر
ان لقیت بان اشد ا

انھوں نے منت مانی ہے کہ مجھ سے مقابلہ ہوا تو مجھے قتل کر دیں گے اور میں نے منت مانی ہے کہ اگر مقابلہ ہوا تو میں ان پر بے جگری سے حملہ کروں گا۔

اسی وجہ سے نذر کو یمین بھی کہنے لگے۔ چنانچہ قبیصہ الیفائے نذر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

فاصبحت قد حلت یمینی وادرکت
بنو ثعل تبلی وراجعنی شعری

اور میری قسم پوری ہو گئی اور بنو ثعل نے میرا قصاص پا لیا اور میری شاعری میرے پاس لوٹ آئی۔

یعنی میں نے نذر کے ذریعہ سے جو چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی وہ میرا قصاص پا لینے کے بعد حلال ہو گئی۔

اسی نذر سے ملتی جلتی صورت ایک یہ بھی تھی کہ بد دعا کرتے تھے کہ اگر فلاں بات یا فلاں وعدے میں ہم جھوٹے ثابت ہوں تو ہم پر فلاں فلاں آفتیں نازل ہوں۔ معدان بن جواس کندی کہتا ہے:۔

ان کان ما بلغت عنی فلامنی
صدیقی وشلت من یدی الاناامل

اگر وہ بات سچ ہے جو تجھے میری نسبت پہنچی تو میرے دوست مجھے ملامت کریں اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں شل ہو جائیں۔

وکفنت وحدی منذرا فی ردائه
وصادف حوطا من اعادی قاتل

اور میں تنہا منذر کو اس کی چادر میں کفناؤں اور حوط کو میرا کوئی دشمن قتل کر ڈالے۔

اشتر نخعی کہتا ہے:۔

بقیت وفری وانحرفت عن العلی
ولقیت اضیافی بوجه عبوس

میں اپنا مال بچا بچا کے رکھوں، اولوالعزمی کے کارناموں سے اعراض کروں اپنے مہمانوں سے بدخلقی سے پیش آؤں۔

ان لم اشن علی ابن حرب غارة
لم تخل یوما من نهاب نفوس

اگر ابن حرب پر ایسی غارت گری نہ کروں جس کا کوئی دن بھی جان و مال کی تباہی سے خالی نہ جائے۔

اس طرح کی قسموں میں دینی قسموں کی جھلک ہے کیونکہ ان میں بھی قسم کھانے والوں کو خیال ہوتا ہے کہ خدا کے گواہ ٹھہرانے کے بعد اگر کوئی بے وفائی ہوئی تو اس کے قہر و غضب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ایک صورت یہ تھی کہ کسی چیز سے بغیر کسی شرط کے رک جاتے، اس کو ایلیۃ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ (البقرہ - ۲۲۶) — جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینوں کی مہلت ہے۔

پھر آہستہ آہستہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی یہاں تک کہ آلیت اقسمت کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ امرؤ القیس کہتا ہے۔

ع وآلت حلفة لم تحلل — اور اس نے نہ ٹوٹنے والی قسم کھائی۔

طرفہ کا شعر ہے :۔

فآليت لا ينفك كشحي بطانة
لعضب رقيق الشفرتين مهند

پس میں نے قسم کھائی کہ میرا پہلو ایک تیز کاٹ والی تلوار سے کبھی خالی نہ ہوگا۔

غنیۃ، حاتم طائی کی ماں کا شعر ہے :۔

لعمري لقد ما عضني الجوع عضة
فآليت الا امنع الدهر جائعا

میری جان کی قسم بھوک کی اذیت نے مجھے پہلے سے ستایا ہے۔ پس میں نے قسم کھائی کہ کسی بھوکے کو کبھی بھی محروم نہ کروں گی۔

اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں "آلیت" کو اقسمت کی جگہ بہت استعمال کیا گیا ہے۔ بعض جگہ اسی تاکید کے مقصد کے لیے لام تاکید استعمال کرتے تھے۔ اس کی مثال قرآن مجید میں بھی ہے۔

وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (المائدہ - ۷۳) — اور اگر باز نہ آئے اس بات سے جو وہ کہتے ہیں تو البتہ ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا ہے عذاب دردناک پکڑے گا۔

دوسری جگہ ہے :۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج - ۴۰) — البتہ اللہ مدد کرے گا ان لوگوں کی جو اس کی مدد کریں گے۔

لبید کا شعر ہے :۔

ولقد علمت لتاتين منيتي
ان المنايا لا تطيش سهامها

اور معلوم ہے کہ میری موت آکے رہے گی، موت کے تیر بے خطا ہوتے ہیں۔

سیبویہ نے کہا ہے کہ لتاتین گویا کہ واللہ لتاتین کے مفہوم میں ہے۔ سیبویہ نے یہ بات بطریق تمثیل کہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں قسم مقصود ہے۔ چنانچہ لام قسم کے ذکر میں اس نے یہ بات کھول دی ہے۔ کہتا ہے :۔

"اور اسی کے مثل لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ" سے یہاں بھی لام بقصد قسم آیا ہے۔ واللہ اعلم"۔

سیبویہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہاں کسی متعین چیز کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محض "لاملئن" قسم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قسم کی اصل حقیقت محض تاکید ہے اس لیے ہر جگہ مقسم بہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں لام قسم آیا ہے سب کو اسی اصول پر قیاس کرنا چاہیے اور اگر اس سے پہلے کوئی ایسا لفظ آئے جو قطعیت اور یقین کو ظاہر کرے تو وہ بھی لفظ قسم سے مشابہ ہوگا جس کی مثال لبید کے اس شعر میں موجود ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً :۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ (یوسف - ۳۵) — پھر ان نشانیوں کے دیکھ لینے کے بعد بھی ان لوگوں نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک مدت کے لیے اس کو ضرور قید کردیں۔

دوسری جگہ ہے :۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ (ص - ۸۵) — کہا پس یہ سچ ہے اور میں سچ ہی کہتا ہوں کہ جہنم کو ضرور بھر دوں گا۔

پس اس طرح کے مواقع میں ہر جگہ مقسم بہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ ان مثالوں میں محذوف ماننا کلام کی بلاغت کے بالکل خلاف ہے۔

یہ ساری تفصیل جو قسم کے مختلف طریقوں اور اس کی تعبیرات سے متعلق اوپر گزری یہ واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ مقسم بہ قسم کے ایسے لوازم میں سے نہیں ہے کہ جہاں اس کا ذکر نہ ہو خواہ مخواہ اس کو محذوف مان لو، قسم کا مقصود محض بات کی تاکید ہوتا ہے یا جس بات کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد کیا گیا ہے اس کے لیے عزیمت کا اظہار۔

قسم کے لیے مقسم بہ ضروری نہیں

مشہور الفاظِ قسم کی تشریح

۷۔ اللہ اور اس کے شعائر کی قسم مفرد اور بسیط معانی اور مفاہیم میں سے نہیں ہے کہ اس کے لیے شروع ہی سے مستقل الفاظ وضع ہو کر استعمال میں آتے۔ یہ چیز تو معاشرتی ضروریات اور دینی عقائد کے تعلق و امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ پس یہ بات کچھ صحیح نہیں ہے کہ جہاں کہیں مقسم بہ مذکور نہ ہو وہاں ہم یہ خیال کرلیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی گئی ہے اور لفظ اللہ یہاں مقدر ہے۔ تعظیمی اقسام پر ہم دسویں فصل میں بحث کریں گے وہاں ان کی اصلی نوعیت پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

اس فصل میں ہم ان الفاظ کے معانی کی تشریح کرنا چاہتے ہیں جو قسم کے لیے عام طور پر مستعمل ہیں اور مقصد یہ دکھانا ہے کہ یہ الفاظ اصلاً اللہ تعالیٰ یا اس کے شعائر یا کسی خاص چیز کی قسم کے لیے نہیں وضع ہوئے تھے، وہ الفاظ یہ ہیں :۔

یمین، نذر، الیۃ، قسم، حلف۔

"یمین" کی اصل حقیقت اور قسم کے لیے اس کا عام استعمال او پر ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں اور اس میں رہن، کفالت اور ضمانت کا جو مفہوم پیدا ہو گیا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

"نذر" کے اصل معنی کسی شے کو دور کرنے اور اس سے بچنے کے ہیں۔ اگر کسی شے کو تم اپنے سے ہٹا کر خدا کے لیے خاص کر دو تو یہ نذر ہے۔ یہیں سے اس میں کسی شے کو حرام کر دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ عبرانی میں اس کا یہی مفہوم ہے۔ پھر یہ لفظ اپنے اوپر کسی لذت کو حرام کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اپنے اوپر کسی شے کو بطور قسم لازم کرنے کے مفہوم کے لیے اس میں وسعت پیدا ہو گئی۔

"الیۃ" کے معنی ہیں کسی امر سے کوتاہی کرنا "آلی" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شے میں کوتاہ اور عاجز ہو۔ پھر یہ کسی شے کو چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہیں سے یہ عورتوں سے قسم کھا کر ترک تعلق کے معنی میں منتقل ہو گیا۔ پھر اس میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور اپنے اوپر کسی شے کے لازم کر لینے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ خواہ یہ لازم کر لینا بصورت اختیار لیکن اس میں غالب پہلو کسی ایسی شے کے لازم کرنے کا ہے جس میں کچھ مضرت کا شائبہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ نذر سے مشابہ ہے۔

ابن زیابہ کا شعر ہے:۔

الیت لا ادفن قتلاکم

فدخنوا المرأ وسربالہ

میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہارے مقتولوں کو دفن نہ کروں گا پس آدمی اور اس کے کپڑوں کو دھونی دو۔

پھر آہستہ آہستہ اس میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور یہ قسم کے مرادف بن گیا۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ "قسم" قسم کے اصل معنی (قطع) کاٹنے کے ہیں۔ قسمت الشئی و قسمتہ اسی معنی میں مستعمل ہیں اور قطع کا لفظ شک و شبہ کی نفی کے لیے عام ہے۔ عربی زبان میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ صریمۃ، جزم، قول فصل، ابانۃ، صدع، قطع وغیرہ سارے الفاظ میں یہ حقیقت موجود ہے۔ ایک ہی روح ان تمام الفاظ کے اندر ساری ہے۔ پھر قولاً کسی بات کو قطعی طور پر واضح کر دینے کے لیے لفظ "قسم" ان میں سے مخصوص ہو گیا اور اس کا استعمال باب افعال سے ہوا کیونکہ باب افعال میں مبالغے کی خاصیت پائی جاتی ہے، مثلاً اسفر الصبح اور اس کے لیے مقسم بہ کوئی ضروری شرط نہیں۔ خواہ مقصود بیان خبر ہو یا اظہار عزیمت۔ طرفہ نے اپنے معلقہ میں کہا ہے۔

ع اقسم بہا لتکتنفن۔ اس کے مالک نے قسم کھائی کہ اس کی بھرائی کی جائے۔

کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ جنوب اپنے مشہور مرثیہ میں کہتی ہے۔

فاقسمت یا عمرو لو نبہاک

اذا نبہا منک امرعضا لا

پس میں نے قسم کھائی اے عمرو کہ اگر وہ (چیتے) اس وقت تجھ کو جگا دیتے تو تیرا جگنا ان کے لیے غضب ہو جاتا۔

ولیلہ سلیمہ کا شعر ہے:۔

فاقسمت لا انفک احدو عبرۃ

تجود بہا العینان منی لتسجما

پس میں نے قسم کھائی کہ برابر میری دونوں آنکھیں آنسو بہاتی رہیں گی۔

خرنق اخت طرفہ کہتی ہے:۔

الا اقسمت اسی بعد بشر

علی حی یموت ولا صدیق

میں نے قسم کھائی ہے کہ بشر کے بعد کسی مرنے والے اور کسی دوست پر غم نہ مناؤں گی۔

قرآن مجید میں ہے:۔

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ (الاعراف - ۴۹) — کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ خدا کی رحمت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (الاعراف - ۲۱) — اور اس (ابلیس) نے ان دونوں سے قسمیں کھائیں کہ میں تم لوگوں کے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ پھر ان کو فریب سے مائل کر لیا۔

اگر تم کہو کہ ان مقامات میں مقسم بہ اللہ تعالیٰ ہے جو مقدر ہے تو ہم کو اس سے انکار ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر مقسم بہ کوئی لازمی چیز نہیں۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اوپر جو دلائل بیان ہوئے وہ کافی ہیں۔ تم دیکھ چکے کہ قسم کبھی اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور کبھی اس کے علاوہ کسی اور چیز کی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سرے سے مقسم بہ ہوتا ہی نہیں۔ ایسے مواقع میں محض تاکید اور جزم کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

"حلف" کے معنی بھی کاٹنے اور تیز ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بالکل لفظ قسم کے مشابہ ہے۔ عربی میں دسنان حلیف اور لسان حلیف وغیرہ محاورات عام طور پر مستعمل ہیں۔ ازہری کے نزدیک یہ "حلف" سے ماخوذ ہے جو ایک تیز نکیلی گھاس ہے پس "حلف علی امر" کا مفہوم بعینہ وہی ہوگا جو "قطع بامر" کا ہوگا۔ لفظ کی اصل معنوی روح یہی ہے۔ پھر یہ لفظ قسم کی طرح بات میں عزیمت اور پختگی کے اظہار کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اور اسی وجہ سے اس کے لیے مقسم بہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں تم دیکھ چکے ہو کہ باہمدگر جس طرح بھی معاہدہ موالات و دوستی ہو گیا۔ فریقین آپس میں حلیف بن گئے اور ایک دوسرے کو حلیف سمجھنے لگے۔ ہم ان میں کہیں یہ بات نہیں پاتے کہ فریقین نے کسی متعین چیز کی قسم کھائی ہو۔

اس فصل میں اور اس سے پہلے کی فصلوں میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ قسم کے لیے مقسم بہ سرے سے کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اس کی تعظیم و احترام کا پہلو تو الگ رہا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ہم نے اب تک جن الفاظ قسم سے بحث کی ہے وہ ایسے ہیں جو قسم کے لیے عام طور پر مستعمل ہیں اور ان کے اصلی معنی ان کا مستعمل

مفہوم کے مقابل میں بالکل غائب ہو چکے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ان سے پہلے بحث کی۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی الفاظ ہیں جن میں ان کے اصلی معانی کی رعایت باقی ہے۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح آئینہ ہو جائے گی کہ ان میں مقسم بہ کی تعظیم کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ آگے کی فصل میں ہم ان الفاظ پر بحث کرتے ہیں۔

قسم کا اصلی مفہوم جبکہ مقسم بہ موجود ہو

۸۔ جو قسم مقسم بہ سے خالی ہو اس کی اصل حقیقت جب تم پر واضح ہو گئی تو مقسم بہ والی قسموں کا سمجھ لینا تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں رہا۔ ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعوے کے گواہ کے طور پر مقسم بہ کو ملا لیا کرتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان قسموں میں بیشتر 'و'، 'ب'، 'ت' وغیرہ کا استعمال ہے جو معیت و صحبت کا مفہوم ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔ "و" اور "ب" معیت و صحبت کے مفہوم کے لیے مشہور و مستعمل ہیں، البتہ "ت" کے بارے میں تمہیں تردد ہوگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت میں "و" ہے جو منقلب ہو کر "ت" بن گئی۔ جس کی مثال تم تقویٰ اور تجاہ وغیرہ الفاظ میں دیکھتے ہو۔

اور پھر ہم نے قسم کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے بھی ہماری اس تاویل کی تائید نکلتی ہے۔ اس میں تم دیکھ چکے ہو کہ قسمیں ہمیشہ سب کے سامنے ہوا کرتی تھیں اور دونوں فریق اپنی قسموں کو مؤکد کرنے کے لیے موقع پر موجود ہوتے تھے۔ غور کیجیے تو اصل مقصد کے اعتبار سے صحیح طریق کار بھی یہی تھا کیونکہ آدمی اپنے تئیں سب کی نظروں کے سامنے جھوٹا ثابت کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ انبیاء کے میثاق کے متعلق فرمایا ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (آل عمران - ۸۱-۸۲)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب کہ اللہ نے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ البتہ میں تم کو جو کتاب و حکمت دوں اور پھر جب آئے تمہارے پاس کوئی رسول مطابق اس کے جو تمہارے پاس ہے تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا، پوچھا کیا تم نے اقرار کیا اور میرا ذمہ لیا کہا ہم نے اقرار کیا۔ کہا بس گواہ ہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ بس جنھوں نے منہ موڑا اس کے بعد تو وہی لوگ بدعہد ہیں۔

یعنی یہ عہد جو تم سے میں نے باندھا ہے اپنی اور تمہاری موجودگی میں باندھا ہے پس اس سے مکرنا کسی حال میں جائز نہیں ہوگا اور جو اس عہد کو توڑیں گے وہ بدعہد اور خائن ٹھہریں گے۔

اسی طرح کی تاکیدات کا اصلی راز یہ ہے کہ آدمی جب کہتا ہے کہ "اشہد بہ" میں اس کی شہادت دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کو اپنے علم، واقفیت اور مشاہدے کی بنا پر کہتا ہوں، صرف دوسروں سے سن کر نہیں کہتا۔ پس ایسی شہادت کے بعد بھی اگر وہ جھوٹ بولے اور مکر جائے تو اس کے لیے کوئی وجہ عذر نہیں ہے۔ اسی بناء پر حضرت یوسف کے بھائیوں نے کہا۔

وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ (یوسف - ۸۱)

اور ہم نے نہیں شہادت دی مگر اس بات کی جو ہم نے جانی اور ہم غیب کے عالم نہیں۔

قسم میں اس پہلو کا استعمال بہترین شکل میں مندرجہ ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:۔

لَٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا (النساء - ۱۶۶)

لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو تم پر اتارا، اس کو اتارا اپنے علم سے اور ملائکہ گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

اس کے علاوہ شہادت میں تاکید و توثیق کے بعض دوسرے نہایت اہم پہلو بھی موجود ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ آدمی جب یہ کہتا ہے کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں بات یوں ہے" تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنا بیان اس ذمہ داری کے ساتھ دے رہا ہے جس ذمہ داری کے ساتھ ایک گواہ کسی معاملہ میں گواہی دیتا ہے۔ گواہی کی ذمہ داریاں ہر شخص کو معلوم ہیں کہ گواہی میں جھوٹ بولنا نہایت مذموم اور گناہ کی بات ہے۔ تمام مذاہب میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت آئی ہے۔ تورات کے احکام عشرہ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ قرآن نے نیکوکاروں کی جو صفات گنائی ہیں ان میں سے ایک صفت ان کی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ جس کی ظاہر تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ "أَنَا أَشْهَدُ" "وَاللّٰهُ يَشْهَدُ" اور "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ" وغیرہ الفاظ عام طور پر عربی زبان میں قسم کے لیے مستعمل ہیں۔ اور یہ بات عربی زبان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ مشرق و مغرب کی دوسری قوموں کے عادات و اطوار کے ہزار اختلافات ہوں۔ لیکن جب وہ بولیں کہ "اللہ اس بات پر گواہ ہے" یا اس کے مشابہ اور ہم معنی کوئی اور فقرہ ہو تو ان کے ہاں بھی اس کا مطلب قسم کے سوا کچھ اور نہیں ہوا کرتا۔ سیبویہ نے لام قسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "افعال میں سے بعض ایسے ہیں جن میں قسم کے معنی پائے جاتے ہیں اور ان کے بعد اگر کوئی فعل آئے تو اس کی نوعیت ٹھیک وہی ہوتی ہے جیسی کہ 'اقسم لافعلن' اور 'اشهد لافعلن' میں ہے۔" اس سے اتنی بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوتی ہے کہ سیبویہ کے نزدیک 'اشهد' کے معنی قسم کے ہیں اور 'اقسم' اور 'اشهد' بالکل یکساں ہیں۔

اور اس سارے جھگڑے کو قرآن مجید کی ایک آیت چکا دیتی ہے جس میں "شہادت" اور "اشہاد" تصریح کے ساتھ قسم کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ فرمایا ہے:۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (المنافقون - ۱-۲)

جب تمہارے پاس منافق آتے ہیں کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے اور اللہ گواہ ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔ پس روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادت کو ان کی قسم اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ اسی طرح ایک دوسری آیت میں بھی تصریح ہے کہ اللہ کی شہادت "قسم" ہے۔

وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ

اور اس سے سزا کو یہ بات دفع کرے گی کہ وہ چار قسمیں اللہ

شَھِدْتُ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ (النور - ۸) کی کھائے کہ وہ جھوٹا ہے۔

ایک اور مقام میں ہے۔

وَیُشْھِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔ (البقرۃ - ۲۰۴) اور وہ اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑالو ہے۔

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شے کی قسم کا مطلب دراصل اس شے کی شہادت پیش کرنا ہے۔ یہاں بقدر ضرورت دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ مزید تفصیل دسویں فصل میں ملے گی۔

رہا مقسم بہ کی تعظیم کا مفہوم تو یہ قسم کے لازمی شرائط میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ خاص خاص صورتوں میں یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ آگے اس پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

قسم کی حقیقت اور اس کا اصلی مفہوم بیان کر چکنے کے بعد اب ہم قسم کے ان مفاہیم کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو اس اصلی مفہوم کے فروع کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اکرام، تقدیس اور استدلال اور ان کو ترتیب کے ساتھ پیش کریں گے تاکہ اس کے تمام پہلو اچھی طرح سمجھ میں آ جائیں اور ان کی رہبری میں تم قرآن کی قسموں پر غور کر کے جو رائے قائم کرو وہ علی وجہ البصیرت ہو۔

قسم مقسم بہ یا مخاطب یا متکلم کی تعظیم کے پہلو سے

۹۔ سچائی عرب کی فطرت کا اصلی جوہر تھی، بالخصوص جب وہ کوئی معاہدہ کر لیتے کسی بات کے لیے زبان دے دیتے، کسی معاملے میں قسم کھا بیٹھتے تو پھر اس سے ٹلنا ان کے لیے ناممکن ہوتا۔ وہ کسی کے حلیف ہوتے یا کسی سے رشتۂ جوار قائم کرتے یا کوئی نذر مانتے تو اپنی ذمہ داری جس طرح بھی ممکن ہوتا ضرور پوری کرتے۔ قسم کھا لینے کے بعد اس سے مکرنا اور پیچھے قدم ہٹانا وہ اپنی غیرت و حمیت کی انتہائی توہین سمجھتے تھے۔ معاہدے کے وقت وہ جو ہاتھ میں ہاتھ دیتے تھے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس عہد کی حرمت کے لیے وہ اپنی جان کے لیے ہر جوکھم برداشت کر لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جان کو خطرے میں ڈالنا قسم کا ایک لازمی مفہوم ہو گیا ہے۔ ہم چھٹی فصل میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ عرب میں سب سے زیادہ عام قسم لعمری (میری جان کی قسم) ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی بات کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دوں گا۔ بعض شاعروں نے قسم کی یہ حقیقت صاف لفظوں میں واضح کر دی ہے۔ ریطہ بنت عباس سلمیہ کا شعر ہے۔

لعمری وما عمری علی بھین　　　لنعم الفتی اردیتم آل خثعما

میری جان کی قسم اور میری جان کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اے آل خثعم تم نے بہترین نوجوان کو ہلاک کیا۔

نابغہ ذبیانی کہتا ہے :-

لعمری وما عمری علی بھین
لقد نطقت بطلا علی الاقارع

میری جان کی قسم اور میری جان کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ بنی قریع بن عوف نے میرے بارے میں بے اصل باتیں کہیں۔

اس کے شواہد کلام عرب میں بہت ہیں۔

یہیں سے قسم کی اس نوع میں مقسم بہ کے احترام کا پہلو بھی پیدا ہو گیا۔ کیونکہ کوئی شخص اس طرح بات کو مؤکد اسی حالت میں کر سکتا ہے جب وہ ایسی چیز کی قسم کھائے جو اس کی نظروں میں محترم اور عزیز ہو۔ اس نوع کی اقسام کی اصل یہی ہے۔ پھر یہیں سے لعمرک (تیری جان کی قسم) وغیرہ اسالیب قسم پیدا ہو گئے جن میں مخاطب کے احترام کا پہلو ہوتا ہے۔ اس طرح کی قسموں میں متکلم کا منشا گویا یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی جان کی نہیں بلکہ تیری جان کی قسم کھاتا ہوں جو میری نظروں میں سب سے زیادہ عزیز و محترم ہے۔ چونکہ عام گفتگو کے لیے یہ اسلوب نہایت دل پسند اور موزوں تھا اس لیے کثرت سے چل گیا اور لعمرک، لعمر ابیک وجدک اور لعمر ربک وغیرہ بہت سے اسلوب رائج ہو گئے۔

یہ الفاظ عام طور پر گفتگو میں رائج ہیں۔ اس لیے ان کی سندیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کر دینا چاہتے ہیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ ان اقسام میں مقسم بہ اگرچہ محترم اور عزیز ہوتا ہے لیکن معبود اور مقدس نہیں ہوتا جیسا کہ آگے والی فصل میں ہم دینی اقسام کے بیان میں دیکھیں گے۔

۲۔ دوسری یہ کہ جب مقسم بہ مخاطب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مقصود مخاطب کے عزت و احترام کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے :-

لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (الحجر - ۷۲) تیری جان کی قسم وہ اپنی مدہوشی میں اندھے ہوئے جا رہے ہیں۔

اس خطاب سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی عزت بڑھائی ہے۔ اسی اسلوب کی دوسری آیت ہے۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ الآیۃ (النساء - ۶۵) پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہیں تا آنکہ وہ تجھے حکم نہ مانیں۔

اور جب مقسم بہ کی اضافت متکلم کی طرف ہوتی ہے تو اس سے خود اس کی عزت و عظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ میری عزت و حرمت ایسی بالاتر شے ہے کہ اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔

یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے اس طرح کی قسم خاکسار اور متواضع بندوں کے لیے موزوں نہیں ہے اور شاید مسیح علیہ السلام نے جو قسم کی مطلق ممانعت فرمائی تو اس سے یہی قسم مراد ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "اپنے سر کی قسم مت کھا کیونکہ ایک بال بھی سفید یا سیاہ کرنے پر تو قادر نہیں ہے"۔

چونکہ بعض قسموں میں بدعہدی پر وبال کی بددعا بھی ہوتی ہے، جیسا کہ چھٹی فصل میں بیان ہو چکا ہے۔ اس لیے بعض اوقات وہ مفہوم بھی اسی طرح کی قسموں میں شامل ہو جاتا ہے۔ گویا قسم کھانے والا یوں کہتا ہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو میری عمر برباد اور میری عزت تباہ ہو جائے۔

لیکن اس ساری تفصیل سے تم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو گی کہ اس قسم کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ مقسم بہ، مخاطب یا متکلم کی طرف مضاف ہو۔ نیز اس کے لیے مخصوص الفاظ ہیں جو اوپر بیان ہوئے اور اس میں قسم اسی چیز کی کھائی جاتی ہے

جس کا احترام اور جس کی عزت متکلم کی نظروں میں مسلم ہو۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کی وہ قسمیں جن میں مقسم بہ ذاریات، عادیات، خنس اور الجوار الکنس وغیرہ کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ اس نوع سے بالکل الگ ہیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ قسمیں عرب کی پختہ قسموں میں سے نہیں ہیں۔ عام طور پر ان کا استعمال محض تاکید کے لیے ہوتا ہے اور اس کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو اُقسمتُ' وغیرہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی 'لعمراللہ' بھی کہہ دیتے ہیں۔ پس عام طور پر جب یہ قسمیں کھاتے ہیں تو اس کا پورا مفہوم نہیں مراد لیتے۔ پورا مفہوم جب مراد لیتے ہیں تو اس کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ ہم ربیعہ سلمیٰ اور نابغہ کے شعروں میں دیکھ چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ایمان غلیظہ کی قسم ہے جس کا بیان اگلی فصل میں آئے گا۔

قسم مقسم بہ کی تقدیس کے پہلو سے

۱۰۔ ہم چھٹی فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ تمدنی ضروریات اور بعض دوسرے حالات مجبور کرتے ہیں کہ آدمی اپنی بات تاکید و توثیق کے ساتھ پیش کرے۔ یہی ضروریات و حالات کبھی کبھی اس بات کے داعی ہوتے ہیں کہ اس تاکید میں پوری شدت اور اس توثیق میں کامل استحکام ہو۔ اس کے لیے طریقہ یہ تھا کہ بالعموم معاہدوں اور قسموں کی تکمیل عبادت گاہوں کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح قسم میں مذہبی تقدس کا رنگ پیدا ہوا۔ اس طرح کی قسموں اور معاہدوں پر گویا اللہ تعالیٰ کی گواہی ثبت ہو جاتی تھی اور ان کے توڑنے میں اس کی خفگی کا اندیشہ تھا۔

شروع شروع میں علیحدہ علیحدہ قوموں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوا کرتی تھیں۔ قدرتی حدود۔ سمندروں اور پہاڑوں نے قوموں کو الگ الگ نہیں کیا تھا۔ جس کے سبب سے پڑوسی قوموں کا آپس میں ٹکرا جانا ہر وقت متصور تھا۔ ایسی حالت میں ایک دوسرے کی زیادتیوں سے بچاؤ کا واحد ذریعہ معاہدہ ہی تھا۔

بعض اوقات مختلف النسل قومیں بھی کسی مشترک دشمن کے مقابل میں دفاع و تعاون کی غرض سے معاہدے کر لیتی تھیں۔ غرض صلح ہو یا جنگ ہر اہم معاملہ میں اصلی سپر معاہدہ ہی بنتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنی قوم کو چھوڑ کر عرب میں آ کے آباد ہوئے اور ابو ملک نے ان کو طاقت ور اور صاحب جمعیت دیکھا تو فوراً ایک خاص رسم کے مطابق ان سے معاہدہ کر لیا کہ آپس میں کوئی جنگ نہ برپا ہو۔ اس معاہدے کے ذریعہ سے حضرت ابراہیم اور ابو ملک باہم گر حلیف بن گئے۔

معاہدے کی تمدنی عظمت و اہمیت پر تاریخ شاہد ہے۔ جب آج بھی متمدن اقوام میں اس کی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے تو قدیم قوموں میں اس کی عظمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جن کی زندگی کا خمیر غیرت و حمیت اور تعدی و دست درازی ہی سے مرکب تھا؟ آج دنیا کا حال کل سے کچھ بہتر نہیں ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کا حال کل سے کچھ زیادہ ہی بُرا ہے۔

آج ظلم و تعدی کے ساتھ جھوٹ اور فریب کی بھی آمیزش ہو گئی ہے اور معاہدوں کا اعتماد بالکل اُٹھ گیا ہے۔ تاہم قومیں اپنی تمدنی ضروریات سے مجبور ہو کر انہی تنکوں کا سہارا ڈھونڈھتی ہیں اور ججوں اور حکام کے سامنے اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ پس جب آج بھی تمام بے اعتمادی اور فریب کے باوجود معاہدہ کی اہمیت اور ضرورت مسلم ہے تو وہ قدیم قومیں

اس پر اعتماد کرنے کی زیادہ حق دار تھیں جو سچائی کو تمام اخلاق کی روح سمجھتی تھیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی تمام معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد اسی چیز پر تھی ان کو جب کوئی اہم ضرورت پیش آتی تو اپنے معبدوں اور تھانوں کے پاس اکٹھی ہوتیں اور وہیں اپنے دیوتاؤں کے سامنے معاہدہ کرتیں۔

زمانہ جاہلیت میں عربوں کا حال بھی یہی تھا۔ وہ جس طرح لڑنے جھگڑنے میں طاق تھے اسی طرح قول کی پاسداری اور وفائے عہد میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ خانہ کعبہ ان کا سب سے بڑا معبد تھا اور اس کا احترام صلح و امن کا سب سے بڑا امنادی۔ یہ اسی کا احترام تھا کہ حج کے مہینوں میں تمام فتنے سرد پڑ جاتے۔ جو عرب اپنی عام زندگی میں شیروں کی طرح خوفناک، اور بھیڑیوں کی طرح خونخوار تھے۔ وہ ان مہینوں کے آتے ہی بھیڑوں سے زیادہ حلیم و بردبار بن جاتے اور راہبوں کے لباس پہن کر اور امن و عدل کی تمام خوبیوں سے بن سنور کر اللہ کے گھر کے گرد اکٹھے ہوتے اور اس جگہ پہنچ کر دشمن اپنے دشمن سے اور حریف اپنے مقابل سے بغیر کسی خوف و اندیشے کے مل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مکہ کو "صلاح" اور "اُم الرحم" بھی کہتے تھے اور جب ان کو کوئی معاہدہ کرنا ہوتا تو وہ اسی معبد کے پاس آتے اور گویا خدا کے سامنے اپنے معاہدے مرتب کرتے۔

عربوں میں معاہدوں کی اصل شکل یہی تھی۔ لیکن پھر شرک کی آلودگی کی وجہ سے کبھی یوں بھی ہونے لگا کہ کسی تھان کے پاس اکٹھے ہو کر معاہدہ کر لیتے، کیونکہ جن تھانوں پر وہ قربانی کرتے تھے ان کو خدا کا شریک اور خدا کے دربار میں ان کو اپنے لیے سفارشی سمجھتے تھے۔

ادائے رسم کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو قربانی کر کے ان کا خون چھڑکتے۔ یا خانہ کعبہ کو چھوتے جیسا کہ ان کے اشعار میں اس کا ذکر ملے گا۔ یا پھر یہ کرتے کہ کسی خوشبو میں اپنے ہاتھ سب ڈالتے اور پھر اس سے خانہ کعبہ کو چھوتے۔ اس کی مثال ہم کو بعثت سے کچھ پہلے بنی عبد مناف کے حلف میں ملتی ہے۔ انھوں نے آپس میں معاہدۂ اتحاد کرنا چاہا تو خانہ کعبہ کے پاس اکٹھے ہو کر ایک لگن میں خوشبو ڈالی۔ پھر تمام حلیفوں نے اس میں اپنے ہاتھ ڈبائے اور پھر ان سے خانہ کعبہ کو چھوا۔ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ بھی اس حلف میں شریک تھے۔ اس خوشبو کی وجہ سے یہ لوگ "مطیبین" سے مشہور ہوئے۔

بعض حالتوں میں یہ رسوم ادا نہیں کیے جاتے تھے۔ صرف فریقین خانہ کعبہ کے پاس جمع ہو جاتے اور اس کے سامنے قسمیں کھا لیتے۔

یہ دینی قسموں کی اصل ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں وسعت ہوئی اور مجرد ذکر کعبہ و شعائر حج نے ایک دینی قسم کی حیثیت حاصل کر لی جیسا کہ ان مثالوں میں تم دیکھو گے۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے:۔

فاقسمت بالبیت الذی طاف حوله

رجال بنوه من قریش وجُرهم

پھر اس گھر کی قسم کھاتا ہوں جس کے گرد قریش و جرہم میں سے وہ لوگ پھرتے ہیں جنھوں نے اس کو بنایا۔

ایضاً

فتجمع ایمن منا ومنکم

بمقسمة تمور بها الدماء

پس ہمارے ہاتھ اور تمھارے ہاتھ ایک ایسی قسم کی جگہ (بیت اللہ) اکٹھے ہوں گے۔ جہاں قربانیوں کا خون بہتا ہوگا۔

اعشیٰ قیس کا شعر ہے:۔

فانی وثوبی راھب الحج والتی

بناھا قصی وحدہ وابن جرھم

راہب حج کی دو چادروں اور اس گھر کی قسم جس کو تنہا قصی اور ابن جرہم نے بنایا کر ہیں......

ایضاً

حلفت لہ بالراقصات الیٰ منیٰ

اذا محرم خلفتہ بعد محرم

میں نے اس کے لیے ان اونٹنیوں کی قسم کھائی جو رقص کرتی ہوئی منی کی طرف جاتی ہیں جب کہ حاجیوں کی ریل پیل ہوتی ہے۔

حارث بن عباد کہتا ہے:۔

کلا ورب الراقصات الیٰ منیٰ

کلا ورب الحل والاحرام

ہرگز نہیں، ان اونٹنیوں کے رب کی قسم جو رقص کرتی ہوئی منی کی طرف جاتی ہیں، ہرگز نہیں، حل و احرام کے رب کی قسم۔

نابغہ ذُبیانی کا شعر ہے:۔

فلا لعمر الذی مسحت کعبتہ

وما ھریق علی الانصاب من جسد

پس نہیں اس کی ذات کی قسم جس کے کعبے کا میں نے طواف کیا اور اس خون کی قسم جو تھانوں پر بہایا گیا۔

والمومن العائذات الطیر تمسحھا

رکبان مکة بین الغیل والسعد

اور اس ذات کی قسم جو چڑیوں کو پناہ دیتی ہے جن پر غیل و سعد کے درمیان مکہ کے قافلے گزرتے ہیں لیکن ان کو چھیڑتے نہیں۔

ما قلت من سیء مما اتیت بہ

اذاً فلا رفعت سوطی الی یدی

کہ میرے متعلق جو غلط بات تم کو پہنچائی گئی ہے وہ میں نے نہیں کہی ہے۔ اگر میں نے وہ بات کہی ہو تو میرے ہاتھ شل ہو جائیں۔

اذاً فعاقبنی ربی معاقبة

قرت بھا عین من یاتیك بالفند

اور میرا رب مجھ کو ایسی سزا دے کہ اس سے میرے حاسد کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔

شاس، علقمہ الفحل کا بھائی کہتا ہے:۔

حلفت بما ضم الحجیج الی منیٰ

وما ثج من نحر الھدی المقلد

اس کی قسم جس نے حاجیوں کو منیٰ کی طرف جمع کیا اور اس خون کی قسم جو قربانی کے جانوروں سے بہایا گیا۔

غلیہ اعرابیہ اپنے بیٹے کی تعریف کرتی ہے:۔

احلف بالمروة یوما والصفا

انك خیر من تفاریق العصا

میں کبھی مروہ کی قسم کھاتی ہوں کبھی صفا کی کہ تو لٹھیا کے ٹکڑوں سے زیادہ نفع بخش ہے۔

تھانوں کی قسم ان شعروں میں ملے گی۔

مہلہل کا شعر ہے:۔

کلا وانصاب لنا عادیة

معبودة قد قطعت تقطیعا

ہرگز نہیں، پُرانے اور معبود انصاب کی قسم جو خوب تراشے گئے ہیں۔

طرفہ کہتا ہے:۔

فاقسمت عند النصب انی لھالك

بملتفة لیست بغبط ولا خفض

کیونکہ میں نے تھان کے پاس قسم کھائی ہے کہ میں کسی سخت معرکے میں جان دے کے رہوں گا۔

متلمس کا شعر ہے:۔

اطردتنی حذر الھجاء ولا

واللہ والانصاب لا تئل

تو نے مجھے دور کیا ہجو کے اندیشے سے لیکن اللہ اور انصاب تھانوں کی قسم تو اس سے نجات نہیں پا سکتا۔

رشید ابن رمیض العنزی کہتا ہے:۔

حلفت بمائرات حول عوض

وانصاب ترکن لدی السعیر

میں نے ان خونوں کی قسم کھائی جو عوض اور ان تھانوں کے پاس بہائے گئے وہ سعیر کے پاس ہیں۔

انصاب کی قسمیں کم ہیں۔ زیادہ تر قسمیں کعبہ اور شعائر حج کی ہیں۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں ہر طرح کے اختلافات عقائد

کے باوجود بیت اللہ کی تعظیم میں بالکل متفق تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کا اولین گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر ہوا یہی ہے۔ یہاں تک کہ عرب کے نصرانی بھی اس گھر کی قسم کھاتے تھے۔ عدی بن زید جاہلیت میں نصرانی ہو چکا تھا، تاہم کہتا ہے:۔

سعى الاعداء لا يألون شرا

عليك ورب مكة والصليب

اعداء سرگرم سازش ہیں اور تمھارے خلاف کوئی شرارت اٹھا نہ رکھیں گے، مکہ کے رب اور صلیب کی قسم!

اخطل اپنی نصرانیت کے پُرفخر اعلانات کے باوجود کہتا ہے:۔

حلفت بمن تساق له الهدايا

ومن حلت بكعبته النذود

میں نے اس ذات کی قسم کھائی جس کے لیے ہدیے پیش ہوتے ہیں اور جس کے کعبے میں نذریں حلال ہوتی ہیں۔

ایضاً

لقد حلفت بما اسرى الحجيج له

وما اناذرين دماء البدن في الحرم

میں نے اس کی قسم کھائی جس کے لیے حجاج سفر کرتے ہیں اور نذر کرنے والوں کی جو قربانیوں کا خون حرم میں نذر کرتے ہیں

اسی کے شعر ہیں:۔

انى حلفت برب الراقصات وما

اضحى بمكة من حجب واستار

میں نے ان اونٹنیوں کے رب کی قسم کھائی جو اتراتی ہوئی منی کی طرف جاتی ہیں اور مکہ کے پردوں اور غلافوں کی۔

وبالهدى اذا احمرت مدارعها

في يوم نسك وتشريق وتخار

اور قربانی کے جانوروں کی قسم جبکہ ان کے پیر قربانی کے ایام میں خون آلود ہو جاتے ہیں۔

اس سے تمھیں معلوم ہوگا کہ اہل عرب جب کسی قسم کو مؤکد اور پُر زور کرنا چاہتے تھے تو کعبہ اور شعائر حج کی قسم کھاتے تھے اور اس بات کو انھوں نے اپنے اشعار میں جابجا ظاہر بھی کر دیا ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے اسلام لانے سے قبل کہا تھا:۔

انى ورب المخيسات وما

يقطعن من كل سربخ جيد

سدھائی ہوئی اونٹنیوں کے رب کی قسم اور ان کے وسیع میدانوں اور پتھریلی زمینوں کے قطع کرنے کی قسم!

يا ليون قد قربت لمنحرها

حلفة بر اليمين مجتهدا

اور قربانی کے جانوروں کی قسم جو قربان گاہ پر پیش کیے جائیں۔ ایسی قسم جو وفادار اور صاحب عزم کی قسم ہے۔

زہیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے:۔

فاقسمت جهدا بالمنازل من منى

وما سحقت فيه المقادم والقمل

میں نے منیٰ کے منازل کی اور اس جگہ کی قسم کھائی جہاں سر منڈائے جاتے ہیں۔

جاہلیت کی یہ بات اسلام میں بھی باقی رہی۔ فرزدق کا شعر ہے:۔

الم ترنى عاهدت ربى واننى

لبين رتاج قائما ومقام

کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میں نے باب کعبہ اور مقام کے مابین کھڑے ہو کر اپنے رب سے عہد کیا ہے کہ

على حلفة لا اشتم الدهر مسلما

ولا خارجا من فى زور كلام

کسی مسلم کو گالی نہ دوں گا اور نہ اپنے منہ سے کوئی جھوٹ بات نکالوں گا۔

حطیئہ کہتا ہے:۔

لعمر الراقصات بكل فج

من الركبان موعدها منا ها

اٹھلا کر چلنے والی اونٹنیوں کی قسم ہر راہ سے جن کی منزل منیٰ ہے۔

مذہبی قسموں کی اصل نوعیت یہ ہے۔ اس سے تمھیں معلوم ہوا ہوگا کہ ان سے مقصود دراصل اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانا ہے۔ پھر اسی سے اس کے وکیل و کفیل ہونے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا یعنی قسم کھانے والوں کی ذہنیت یہ ہوتی تھی کہ اگر انھوں نے اس قسم یا عہد میں جھوٹ اور فریب کو راہ دی تو یہ موجب قہر الٰہی ہوگا۔ ماسبق کے جو اشعار اوپر مذکور ہوئے ہیں، ان میں یہ تصور پوری طرح نمایاں ہے۔

رہے صلحاء و انبیاء تو وہ جب اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہراتے ہیں تو ان کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کا اظہار اور قسم کی پختگی اور قطعیت کا اعلان ہوتا ہے۔ اس فصل کے آخر میں کچھ اشعار مذکور ہیں جن سے ہمارے اس خیال کا ثبوت ملے گا۔ اور یہ جو اہل عرب اپنی قسموں میں خانۂ کعبہ، قربانی اور بیت اللہ کو چھونے کا ذکر کرتے ہیں تو ان سب سے مقصود محض شہادت کے مفہوم کو تقویت دینا اور قسم کے طریق کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ مجرد اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم پورا تنبہ نہیں پیدا کرتی اس وجہ سے وہ کوشش کرتے ہیں کہ قسم کی اصل اور اس کی صورت کو نگاہ کے سامنے رکھ دیں تاکہ قلب پر اس کا اثر پڑے۔

ہم نے قسم کا جو مفہوم اہل عرب کے حالات اور ان کے اشعار سے اخذ کیا ہے اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے۔

کہ وہ جگہ جگہ اپنی قسموں میں اللہ کی گواہی کا ذکر کرتے ہیں۔ "اللہ گواہ ہے" "اللہ جانتا ہے" اور اس کے ہم معنی الفاظ ان کے کلام میں بہت ملتے ہیں۔ عمرو بن معدیکرب کہتا ہے:-

اللہ یعلم ما ترکت قتالھم

حتی علوا فرسی باشقر مزبد

خدا گواہ ہے کہ میں نے ان سے مقابلہ نہیں چھوڑا یہاں تک کہ سرخ اور جھاگ والے خون کے ساتھ میرے گھوڑے پر چڑھ گئے۔

حارث بن عباد کا شعر ہے:-

لم اکن من جناتھا علم اللہ

وانی بحرھا الیوم صالی

خدا گواہ ہے کہ میں اس فساد کے ابھارنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں مگر اس فساد کی آگ سے جل رہا ہوں۔

نابغہ نے سانپ اور اس کے ایک حلیف آدمی کا قصہ نقل کیا ہے۔ اس قصہ سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ قصہ یوں ہے کہ سانپ نے اپنے حلیف آدمی کے لڑکے کو ڈس لیا جس سے وہ مر گیا۔ لیکن پھر دیت کے وعدہ پر فریقین میں صفائی ہو گئی۔ لیکن جب آدمی نے اپنی دیت پوری وصول کر لی تو سانپ کو بھی قتل کر دینا چاہا لیکن وہ کسی طرح بچ گیا۔ اس کے بعد آدمی نے اس کو دوبارہ صلح و محبت کی دعوت دی۔ اس واقعے کو نابغہ بیان کرتا ہے:-

آدمی:-

فقال تعالی نجعل اللہ بیننا

علی مالنا او تنجزی لی آخرہ

(آدمی نے) کہا آؤ ہم اپنے معاملہ پر از سر نو اللہ کو گواہ بنائیں۔ یا پھر تم آخر تک اپنے وعدہ کو پورا کرو۔

سانپ:-

فقالت یمین اللہ افعل انني

رایتک مسحورا یمینک فاجرۃ

(سانپ نے) جواب دیا خدا کی قسم اب میں یہ نہیں کرنے کا تم سحر زدہ ہو اور تمہاری قسم جھوٹی ہے۔

ہمارے اس دعوے کا نہایت واضح ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے میں بھی موجود ہے۔ آپؐ نے تمام اہم امور و فرائض کے ذکر کے بعد فرمایا: اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ۔ اللّٰھم اشھد (آگاہ میں نے پہنچا دیا، اللہ تو گواہ ہے) دیکھو آپؐ نے جو عہد لیا اس پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرایا۔

اسی ذیل میں ابن اللتبیہ ازدی کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیل صدقہ کے لیے عامل بنایا لیکن انھوں نے اس فرض کی ادائیگی کے دوران میں کچھ ہدیے وغیرہ قبول کر لیے۔ آپؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے اس پر غصہ کا اظہار فرمایا اور ان کی ذمہ داریوں کو یاد دلانے کے بعد آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا "اللّٰھم ھل بلغت" (خداوندا میں نے پہنچا دیا)

آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ کو گواہ ٹھہرانے کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعے سے بھی ملتی ہے۔ کتاب پیدائش باب ۲۲ میں ہے۔

"پھر ابرام نے سدوم کے بادشاہ سے کہا کہ میں نے خداوند تعالیٰ، آسمان و زمین کے مالک کی طرف ہاتھ اٹھایا ہے۔ (قسم کھائی ہے) کہ میں نہ تو کوئی دھاگا نہ جوتی کا تسمہ نہ تیری کوئی اور چیز لوں"

"ہاتھ اٹھایا ہے" یعنی اس پر اللہ کی قسم کھائی ہے، اس کو گواہ ٹھہرایا ہے، اور اس سے معاہدہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک نماز میں ہاتھ اٹھانے کی اصل حقیقت بھی عہد و شہادت ہی ہے۔ اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب اصول الشرائع میں کی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں بھی جگہ جگہ اس کی تصریح موجود ہے اور اس کے بعض شواہد آٹھویں فصل میں بیان ہو چکے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دینی قسموں کی اصل حقیقت بھی شہادت ہی ہے۔ ان میں تعظیم کا مفہوم محض مقسم بہ کے جہت سے داخل ہو گیا ہے۔ قسم کے اصل مفہوم یعنی شہادت کے جہت سے نہیں داخل ہوا ہے۔ اس حقیقت کی پوری توضیح ان قسموں سے ہو گی جن میں مقسم بہ محض استدلال کے لیے ہے اور یہ بلاغت کا ایک نہایت ہی لطیف باب ہے جس کے حقائق آئندہ فصلوں میں بیان ہوں گے۔

قسم بغرض استدلال

۱۱- اوپر کی تفصیلات سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اہل عرب قسم میں اپنی جان کی شہادت یا اللہ تعالیٰ کی شہادت پیش کرتے تھے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی شہادت سب سے بڑی شہادت تھی اس لیے اس کا رواج زیادہ ہوا۔ اس سے ان لوگوں کو جو عربی کے اسالیب اور آدابِ بلاغت سے اچھی طرح واقف نہ تھے یہ غلط فہمی ہو گئی کہ شہادت میں صرف معبود کو پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ہمیشہ مقسم بہ کی تعظیم کا پہلو مدِ نظر ہوتا ہے لیکن جب تم کلامِ عرب پر غور کرو گے تو تمھیں معلوم ہو گا کہ اہلِ عرب بسا اوقات ایسی چیزوں کو بھی شہادت میں پیش کرتے تھے جن کو نہ تو پوجتے تھے اور نہ ان کی کسی طرح کی تعظیم ہی کرتے تھے۔ بلکہ قسم سے مقصود محض اپنی بات پر دلیل لانا ہوتا تھا یہاں تک کہ مذہبی قسموں میں بھی بسا اوقات استدلال کا پہلو مضمر ہوتا تھا جس کی تفصیل پندرھویں فصل میں تمھارے سامنے آئے گی یہاں ہم محض استدلالی قسم کے بیان پر کفایت کرتے ہیں اور کلامِ عرب سے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے ہیں۔

ابو العریان طائی حاتم کی مدح میں کہتا ہے:-

قد علموا ان القدور تعلمہ

ومستھل الغمود مطرد

لوگ جانتے ہیں اور دیگیں گواہ ہیں اور پیہم چلنے والی چمک دار چھریاں

ان لیس عند اعتراد طاد قھا

لدیک الا استلالھا مداد

کہ زمانہ قحط میں شب میں کسی آنے والے کی میزبانی میں تیری طرف سے صرف اتنی تاخیر ہوتی ہے جتنی دیر میں کسی جانور کو ذبح کرنے کے لیے تو اپنی تلوار کھینچ لے۔

راعی کے شعر ہیں:-

ان السماء وان الريح شاهدة

والارض تشهد والايام والبلد

آسمان اور ہوا شاہد ہیں، زمین شاہد ہے جنگلیں شاہد ہیں اور سرزمین شاہد ہے۔

لقد جزيت بنى بدر ببغيتها

يوم الهباءة يوما ماله قود

کہ میں نے بنی بدر کو ہباۃ کی لڑائی میں ان کی سرکشی کا مزہ چکھایا ایسی لڑائی کہ اس کا بدلہ ممکن نہیں۔

والخيل تعلم انا في تجاولنا

عند الطعان اولو بؤسى وانعام

گھوڑے جانتے ہیں (گواہ ہیں) کہ ہم نیزہ بازی میں جولانی کے وقت کسی کے لیے تازیانۂ عذاب ہیں اور کسی کے لیے رحمت۔

عنترہ کا شعر ہے:۔

والخيل تعلم والفوارس انني

فرقت جمعهم بطعنة فيصل

گھوڑے اور شہسوار گواہ ہیں کہ میں نے ایک فیصلہ کن نیزہ بازی سے ان کی جمعیت منتشر کردی۔

ان مثالوں میں دیکھو ان شاعروں نے دیگوں، چھریوں، آسمان، زمین، جنگلوں، سرزمین اور گھوڑوں، شہسواروں کو گواہی میں پیش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو پیش کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اگر تم ان سے پوچھو اور یہ جواب دے سکیں تو یہ ہمارے دعوے کی تصدیق کریں گے۔ اس دعوے کی تائید میں فضل بن عیسیٰ ابن ابان کا یہ وعظ بھی پیش کیا جا سکتا ہے:۔

سل الارض فقل من شق انهارك وغرس اشجارك وجنى ثمارك فان لم تجبك حوارا اجابتك اعتبارا۔

زمین سے پوچھو نہریں کس نے جاری کیں، تیرے درخت کس نے لگائے، تیرے پھل کس نے چنے۔ اگر زبانِ قال سے جواب نہ دے سکے گی تو زبانِ حال سے ضرور جواب دے گی۔

اور معلوم ہوا ہے کہ یہ کلام صحف ایوب باب ۱۲، ۷۔۱۰ سے ماخوذ ہے اس میں یوں وارد ہے:۔

حیوانوں سے پوچھ اور وہ تجھے سکھائیں گے۔

اور ہوا کے پرندوں سے دریافت کر اور وہ تجھے بتائیں گے۔

یا زمین سے بات کر اور وہ تجھے سکھائے گی۔

اور سمندر کی مچھلیاں تجھ سے بیان کریں گی۔

کون نہیں جانتا کہ ان سب باتوں میں خداوندی کا ہاتھ ہے جس نے یہ سب بنایا؟ اسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کی جان اور کل بنی آدم کا دم ہے۔

بالکل اسی کے مثل کلام تثنیہ باب ۳۰۔ ۱۹ میں وارد ہے:۔

"میں آج کے دن آسمان و زمین کو تمہارے برخلاف گواہ بناتا ہوں کہ میں نے زندگی اور موت کو اور برکت اور لعنت کو تیرے آگے رکھا ہے پس تو زندگی کو اختیار کر کہ تو بھی جیتا رہے اور تیری اولاد بھی"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ساتھ میرا یہ عہد کوئی رازدارانہ کارروائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک علانیہ اور مشتہر بات ہے۔ پس اگر تم اس کو توڑو گے تو اس کا وبال ہمیشہ کے لیے تم سے چمٹ جائے گا۔ اس زمین کی پشت پر اور اس آسمان کے نیچے سے تم پر عذاب اور لعنت کی بارش ہوتی رہے گی۔ پس عہد کے دوام اور نقض عہد کے نتائج کے لزوم کو بیان کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر دو ایسے گواہ قائم کر دیے جو ان پر ہمیشہ مسلط رہیں گے۔

زبانِ حال سے شہادت دینے والی چیزوں کی قسم کے بارے میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہ تمام تر "شہد" اور "علیم" وغیرہ الفاظ کے ساتھ آئی ہیں۔ چنانچہ اوپر جو مثالیں ہم نے پیش کی ہیں ان میں یہی الفاظ وارد ہیں لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ کلامِ عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کی قسم ان الفاظ کے ساتھ بھی کھاتے ہیں جو قسم کے لیے مخصوص ہیں، مثلاً "واؤ قسم" یا "لعمر" وغیرہ کے الفاظ۔ پس اگر اوپر کی مثالوں سے کسی کا دل مطمئن نہ ہو تو اس کی واضح اور صریح مثالیں بھی موجود ہیں۔

عروہ بن مرہ ہذلی کا شعر ہے:۔

وقال ابو امامة يال بكر

فقلت ومرخة دعوى كبير

اور ابو امامہ نے پکارا اے قبیلہ بکر کے لوگو مدد کرو! میں نے کہا مرخہ کی قسم بڑی خوفناک پکار ہے۔

ابو امامہ نے قبیلہ بکر سے مدد چاہی اس پر شاعر ابو امامہ کا مذاق اڑا رہا ہے کہ کیسے زبردست لوگوں کی مدد چاہی گئی ہے! اور کیسا خوفناک استغاثہ ہے! اور اس پر ایک کمزور درخت (مرخہ) کی قسم کھائی ہے جو اپنے سائے کے نیچے ایک شخص کو بھی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور عربی ادب میں ضعف و ناتوانی کی مثال کے لیے مخصوص ہے۔

ابو جندب ہذلی نے اس قسم کی اصلی حقیقت پوری طرح واضح کردی ہے۔

وكنت اذا جاري دعا لمضوفة

اشمر حتى ينصف الساق مئزري

میرا حال یہ ہے کہ جب میرا پڑوسی کسی ضرورت میں مجھ سے طالب مدد ہوتا ہے میں فوراً اس کے لیے چاک و چوبند ہو جاتا ہوں۔

فلا تحسبا جاري لدى ظل مرخة

ولا تحسبنه فقع قاع بقرقر

پس میرے پڑوسی کو کسی "مرخہ" کے سایہ کے نیچے مت سمجھو اور نہ کسی نشیبی زمین کی نرم گھاس سمجھو۔

بہرس نے اپنے باپ کے قاتل جساس کو قتل کرتے وقت جو قسم کھائی وہ بھی اس ذیل میں پیش کی جا سکتی ہے:۔

وفرسي واذنيه ورمحي ونصليه

وسيفي وغراريه لا يترك الرجل

میرے گھوڑے کی قسم اور اس کی کنوتیوں کی، نیزے کی قسم اور اس کی نوک کی۔ میری تلوار کی قسم اور اس کی دھار کی کہ آدمی

قاتل ابیہ وھو ینظر الیہ۔ اپنے قاتل کو دیکھ کر نہیں چھوڑ سکتا۔

ہجرس نے ان تمام چیزوں کی قسم بطور ثبوت اور شہادت کے کھائی ہے۔ اس کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ میں نیزہ بازی اور شمشیر زنی اور حملہ و دفاع میں ماہر ہوتے ہوئے اپنے باپ کے قاتل کو بچ کے نکل جانے کا موقع کیسے دے سکتا ہوں۔ اس پر اس نے ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جن سے اس کے دعوے کی تصدیق اور اس کے قول کی توثیق ہوتی ہے۔

طرفہ کی ایک قسم بھی اسی ذیل کی ہے۔

وقربة ذی القربی وجدك اننی

متی یك امر النکیثة اشهد

قرابت مندوں کے رشتۂ قرابت کی قسم اور تیرے جد کی قسم جب کوئی بڑا معاملہ امتحان کا پیش آئے گا تو میں جان و مال سے حاضر ہوں گا۔

مطلب یہ ہے کہ جب اہل قرابت کسی بڑے مقصد کے لیے مجتمع ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہوں اور رحم کا پاس جو ایک عظیم الشان ذمہ داری ہے اس سے بے پروائی برتوں۔ اہل عرب کے ہاں رحم اور رخوا دو چیزیں تمام معاشرتی و اجتماعی تعلقات کی بنیاد تھیں۔ شاعر نے اپنی شرکت کو ضروری بتلانے کے لیے اسی رشتۂ رحم کو بطور دلیل شہادت میں پیش کیا ہے۔

حصین بن حمام اپنے دوست نعیم بن حارث کے مرثیے میں کہتا ہے۔

قتلنا خمسة ورموا نعیما

وکان القتل للفتیان زینا

ہم نے پانچ کو قتل کیا اور انھوں نے نعیم کو نشانہ بنایا اور قتل ہونا نوجوان کے لیے شرف ہے۔

لعمر الباکیات علی نعیم

لقد جلت رزیته علینا!

نعیم پر ماتم کرنے والیوں کی قسم! نعیم کا قتل ہمارے لیے سخت مصیبت ہے۔

یہاں ماتم کرنے والی عورتوں کی قسم اس وجہ سے کھائی ہے کہ ان کی حالت درحقیقت اس حادثہ کی نوعیت پر گواہ ہے۔

قسم کی یہ نوع، اگرچہ اپنی باریکیوں اور دوسری انواع قسم کے عام ہونے کے سبب کچھ زیادہ نہ پھیل سکی۔ تاہم عربی زبان میں یہ ایک معروف و مشہور اسلوب ہے جس میں بلاغت کلام کے بے شمار ابواب، جیسا کہ سترھویں فصل میں معلوم ہوگا، جمع ہو گئے ہیں، بلکہ نہایت قابل اطمینان دلائل کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اسلوب عرب اور عجم دونوں میں معروف ہے اور نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے یونانی ادب سے اس کی بعض مثالیں پیش کریں۔

قسم بطور استدلال ڈیموس تھینیز کے کلام میں

۱۲۔ یونان کے لوگ ابتداءً بالکل آزاد تھے۔ وہاں کا نظام حکومت جمہوری تھا۔ شخصی حکومت کے اقتدار سے یہ لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ یہاں تک کہ سکندر اعظم کا باپ فیلیوس پیدا ہوا اور اس نے ان پر اپنی شخصی حکومت قائم کر لی لیکن اس کو اپنا اقتدار جمانے

کے لیے جمہور سے بہت سے خوفناک مقابلے کرنے پڑے۔ ان مقابلوں میں عوام کی رہنمائی کی باگ یونان کے سب سے بڑے خطیب ڈیموس تھینیز کے ہاتھوں میں تھی۔ جب فیلیوس نے جمہوریت کو شکست دے دی تو دارالسلطنت ایتھنز کے باشندوں کو تسلی دینے اور ان کی جانبازی اور حریت پرستی کی تعریف کرنے کے لیے ڈیموس تھینیز نے ایک مشہور تاریخی تقریر کی۔ اس میں اس نے اپنے حریف اس کی نس کے دلائل کی، جو بادشاہ کا حامی تھا، پرزور تردید کی ہے۔ اس تقریر کے بعض فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"اے اہل ایتھنز! جس وقت کہ تم نے یونان کی آزادی و حفاظت کی راہ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں تو تم باطل پر نہیں تھے۔ اس کے لیے تمہارے اسلاف کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے اور یقیناً وہ باطل پر نہیں تھے۔ تمہارے وہ اسلاف جنھوں نے ماراتھون کے معرکے میں جانبازی کے جوہر دکھائے۔ جنھوں نے سلامیس کی لڑائی میں اپنی گردنیں کٹوائیں۔ جنھوں نے پلاٹیہ کے مورچہ پر سرفروشیاں کیں، وہ باطل پر نہیں تھے، ہرگز باطل پر نہیں تھے! ان جاں نثاروں کی قسم جنھوں نے ماراتھون کے معرکے میں اپنی جانیں جوکھم میں ڈالیں، ان سرفروشوں کی قسم جو سلامیس اور ارطیمیم کی بحری جنگ میں شریک تھے، ان سورماؤں کی قسم جنھوں نے پلاٹیہ میں دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا!!!! اے اس کی نس! اہل ایتھنز نے اس وقت صرف انھیں کی عزت نہیں کی جو میدان جنگ سے کامیاب واپس آئے بلکہ ان کی لاشوں کا بھی عمومی احترام کیا جنھوں نے بہادرانہ اپنی گردنیں کٹوا دیں"

یعنی پبلک کی طرف سے احترام و اعزاز ان کی کامیابی پر نہیں ہوا بلکہ محض جانبازی و سرفروشی پر ہوا اسی طرح آج تم اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکے لیکن اعزاز کے لیے یہ بس ہے کہ تم نے آزادی وطن کی راہ میں گردنیں کٹوا دیں۔

ڈیموس تھینیز کی مذکورہ بالا قسموں پر غور کرو اس نے حاضرین کے سامنے کس طرح ان کے اسلاف اور ان کے پرفخر کارناموں کو لا کھڑا کر دیا ہے تاکہ ہر سننے والے کا دل جوش اور فخر سے معمور ہو جائے اور پھر ان کے کارناموں کو مخاطب جماعت کی ناکام مگر جانبازانہ جدوجہد کی صحت و صداقت پر دلیل ٹھہرایا ہے اور کلام کا اسلوب اس قسم کا ہے کہ جو تاکید و توثیق کے لیے آتی ہے۔ اس قسم کی بلاغت پر ڈیموس تھینیز کے تمام ناقدین کا اتفاق ہے۔ لیکن جس طرح ہمارے علمائے متاخرین اس طرح کے اسالیب بلاغت سے آہستہ آہستہ ناآشنا ہو گئے اسی طرح یونان کے علماء متاخرین بھی ان چیزوں کے ذوق سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ لانجنوس، جو ڈیموس تھینیز کے چھ سو برس بعد پیدا ہوا اور ایتھنز میں بلاغت کا معلم اور سرآمد روزگار تھا، اپنی فن بلاغت کی کتاب میں اس قسم کا ذکر کرتا ہے، اور اس کی ساری خوبی اور بلاغت کا راز یہ بتاتا ہے کہ اس میں مقسم بہ کی غایت درجہ تعظیم ہے۔ گویا ڈیموس تھینیز نے قوم کے اسلاف کو معبودوں کی حیثیت دے کر ان کی قسم کھائی ہے۔

لانجنوس کو اس قسم کے بارے میں ان لوگوں کی رائے سے اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ اس قسم میں وہ اسلوب ملحوظ ہے جو یولیوس شاعر نے اپنے تاج کی قسم میں ملحوظ رکھا ہے۔ ہم یہاں یولیوس کی قسم کی بھی تفصیل کر دیتے ہیں۔ تاکہ ہمارے دعوے کا ایک عمدہ ثبوت بھی سامنے آ جائے اور یہ امر بھی واضح ہو جائے کہ ڈیموس تھینیز کی قسم کے بارے میں صحیح رائے وہی ہے جس کو قبول کرنے سے لانجنوس کو انکار ہے۔

قسم بطور استدلال پولیبوس کے کلام میں

۱۳۔ اہلِ یونان کا اپنی حریت و آزادی کے زمانہ میں، یہ دستور تھا کہ جب ان میں سے کوئی شخص کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتا تو بطور اعزاز و تکریم اس کے سر پر تاج رکھتے۔ ماراتھون کے معرکے میں مشہور یونانی شاعر پولیبوس نے ایسے جوہر دکھائے کہ اہلِ ملک کی طرف سے وہ بھی اس عزت کا مستحق ٹھہرا لیکن اس کے بعض حاسدوں نے لوگوں کے دلوں سے اس کی وقعت کم کرنے کے لیے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ وہ قوم کا غدار ہے۔ اس تہمت کی تردید میں اس نے ایک نظم لکھی جس کے دو شعروں کا ترجمہ یہ ہے:۔

"نہیں، اپنے سر کے تاج کی قسم جو ماراتھون کے معرکے کے موقع پر میں نے پایا، میرا کوئی حاسد یہ نہیں بتا سکتا کہ میں اپنی قوم کے لیے اپنے دل میں کوئی عداوت چھپائے ہوئے ہوں۔"

اس نے اپنی قوم کے ہاتھوں جو تاج پایا ہے اسی کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ وہ اپنی قوم کا دشمن نہیں ہو سکتا، گویا اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس قوم نے ایسی عظیم الشان عزت سے اس کو سرفراز کیا ہے اس قوم کے خلاف وہ اپنے دل میں کسی عداوت کو کیسے جگہ دے سکتا ہے؟

غرض جس طرح بعض دوسری مثالوں میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس مثال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قسم صرف معبودوں اور دیوتاؤں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور اس سے ایک طرف تو وہ بنیاد بالکل ڈھے جاتی ہے جس پر لانجنوس نے اپنی عمارت قائم کی ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ ڈیموس تھینیز اور پولیبوس دونوں کی قسمیں بالکل یکساں نوعیت کی ہیں اور ان کا مقصد استدلال ہے نہ کہ محض مقسم بہ کی تعظیم۔ اگر ان قسموں میں مقسم بہ قابلِ تعظیم ہے تو یہ بالکل اتفاق کی بات ہے۔ نفسِ قسم کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی بات ہم نے اوپر عروہ بن مرہ کے شعر میں دیکھی ہے جو گیارھویں فصل میں گزر چکا ہے۔ اس نے مرخہ کی قسم کھائی ہے اور مقصود اس کو ضعف اور ذلت کی مثال کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔

استدلالی قسموں میں دلیل کا پہلو

۱۴۔ اوپر کی فصلوں میں ہم نے بہت سی استدلالی قسمیں پیش کی ہیں جو نظم و نثر ہر طرح کے کلام اور عرب و عجم سب کے مذاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت تم پر واضح ہو گئی کہ یہ بلاغت کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اب اس فصل میں ہم چاہتے ہیں کہ ان استدلالی قسموں کے اندر جو پہلو دلیل کے ہیں ان کی تشریح کریں تاکہ یہ بحث بالکل منقح ہو کر سامنے آجائے۔ یہ بحث اس کتاب کے مہمات مباحث میں سے ہے۔ یہاں صرف چند اجمالی اشارات ہوں گے۔ آگے جہاں ہم قسم کے ابوابِ بلاغت کی تفصیل کریں گے، وہاں اس کی مزید وضاحت ملے گی۔

سب سے پہلی بات اس ذیل میں یہ یاد رکھنے کی ہے کہ جب قسم بغرضِ استدلال کھاتے ہیں تو بسا اوقات اس سے مقسم علیہ کی غایت درجہ وضاحت کو بتانا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً راعی کا شعر اوپر گزر چکا ہے کہ

ان السماء وان الریح شاهدة والارض تشهد والایام والبلد

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ شہرت کی اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز بھی اس کے ذکر سے ناآشنا نہیں رہ گئی ہے۔ آسمان کے اطراف اور زمین کے اکناف میں جتنی چیزیں موجود ہیں سب اس کی گواہی دیتی ہیں، ہواؤں نے اس کا چرچا گوشے گوشے میں پھیلا دیا ہے اور زمانے نے صفحاتِ دہر پر اس کے بقائے دوام کی مہر ثبت کر دی ہے اور اس میں تاکید کا پہلو یہ ہے کہ جب یہ بے جان اشیاء اس چیز کی گواہ ہیں تو پھر آنکھ کان والوں کا کیا ذکر، وہ تو بدرجۂ اولیٰ اس کے جاننے والے اور بیان کرنے والے ہوں گے۔

یہ بظاہر ایک مبالغے کا اسلوب ہے لیکن اس کی بنا واقفیت پر ہے کیونکہ مراد اس سے مقسم علیہ کی غایت شہرت اور اس کے متعلق عام علم و واقفیت کا اظہار ہے۔ اوپر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو قسم گزر چکی ہے وہ بھی اسی باب سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے بھی آسمان و زمین کو گواہ ٹھہرایا ہے۔

کبھی بطریق تشبیہ مثال دینا مقصود ہوتا ہے اور اس صورت میں درحقیقت متکلم کی طرف سے ایک ادعا پنہاں ہوتا ہے۔ اس کی مثال عروہ بن مرہ کی قسم ہے، قبیلہ بکر، جس کے سامنے ابو امامہ نے فریاد کی تھی، اس کی مثال عروہ نے مرخہ ایک بے سایہ درخت سے دی ہے۔ یہ مثال محض ادعا ہے۔ لیکن دعویٰ جب بطریق اشارہ پیش کیا جاتا ہے تو مخاطب اس کو نہایت آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ تشبیہ و کنایے میں بھی یہی بات ہوتی ہے اور اس کی تفصیلات کتبِ معانی میں موجود ہیں۔ ہم انشاء اللہ سترھویں فصل میں اس کی مزید تشریح کریں گے۔

بعض اوقات قول کی تائید مقصود ہوتی ہے اور چونکہ مقسم بہ سے مقسم علیہ کی تائید ہوتی ہے اس لیے اس کی قسم کھاتے ہیں۔ اس کی مثال پولیبوس کے کلام میں موجود ہے۔ جس تاج سے قوم نے اس کی عزت افزائی کی تھی اسی کو اس نے شہادت میں پیش کیا ہے کہ قوم کی نظروں میں عزت کی سب سے بڑی چیز یہ تاج ہے اور جب میں نے یہ دائمی فخر اپنے لیے قوم کی طرف سے مخصوص کرا لیا تو میرا کوئی حاسد کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی قوم سے نفرت کرتا ہوں!

لیکن اس استدلال میں ایک کمزوری تھی۔ اس کا مخالف کہہ سکتا تھا کہ قوم کی طرف سے اس عظیم الشان عزت افزائی کے باوجود تم نے احسان فراموشی کی۔ اس کے لیے اس نے تاج کے ذکر کے ساتھ اپنے شرفِ نفس کا بھی حوالہ دیا کہ میں نے یہ عزت سب سے بڑی قومی جنگ میں حاصل کی ہے جس میں قوم کے تمام سرداروں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے، لیکن کوئی بھی میرے رتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ اس تاکید مزید کے بعد صرف وہی شخص پولیبوس پر شبہ کر سکتا ہے جو حاسد ہو اور جس کو بڑوں کے ساتھ سوءِ ظن رکھنے کی خو ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہاں دعوے اور دلیل میں پوری پوری مطابقت نہیں ہے۔

بعض اوقات دعوے پر ایک قاطع حجت پیش کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کے لیے بالعموم یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ کسی ایسی چیز کو پیش کرتے ہیں جو مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان ایک جامع کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس کی مثال ڈیموس تھینیز کی قسم ہے۔ اس نے پہلے اسلاف کے وہ کارنامے بیان کیے جن کی عظمت مخاطب کے نزدیک مسلم ہے اور پھر انہی کارناموں کو ان لوگوں کے حسنِ عمل کے ثبوت میں پیش کیا ہے جنھوں نے اپنے پُرفخر اسلاف کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شروع ہی میں کہا تھا کہ تمھارے لیے تمھارے اسلاف کے روشن کاموں میں نمونہ ہے۔

اور اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح کی قسموں میں سب سے زیادہ بلیغ اسلوب یہی ہے جو ڈیموس تھینیز نے اختیار کیا۔

بعض دلائل قرآن مجید سے

۱۵۔ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ قسم سے اصل مقصود استشہاد و استدلال ہے تعظیم صرف اس صورت میں پیش نظر ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر کی قسم کھائی جائے، بلکہ اس صورت میں بھی، بعض اوقات، جیسا کہ اوپر ہم دکھا چکے ہیں، صرف استدلال مقصود ہوتا ہے۔ پس ان باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ قرآن کی وہ قسمیں جن پر معترض نے دو آخری شبہے وارد کیے ہیں، تمام تر استشہاد و استدلال کے لیے ہیں۔

اگر کوئی معترض یہ کہے کہ ہم مانتے ہیں کہ قسم کی اصل شہادت کے لیے ہے لیکن چونکہ اس کا استعمال زیادہ تر تعظیم کے لیے ہے اس لیے اب اس کا یہی مفہوم باقی رہ گیا ہے اور اصل مفہوم یعنی شہادت بالکل غائب ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ کی قسم کی ممانعت وارد ہے۔ پس اس کے اصل مفہوم کا لحاظ اب صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کوئی قوی دلیل اس کے لیے موجود ہو۔

اس اعتراض کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ یہ ہم تسلیم کرتے ہیں، لیکن اقسام قرآن کے اس خاص مفہوم کی طرف ہماری توجہ خود قرآن کی رہنمائی سے ہوئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے بعض دلائل ہم یہاں بیان کریں۔

۱۔ قرآن نے ایک ہی لفظ کبھی بندے کے لیے استعمال کیا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے لیے، ایسی صورت میں لا محالہ لفظ کے مختلف مفاہیم میں فرق کرنا پڑتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو اس کی عظمت و تقدیس کے منافی ہو۔ مثلاً صلوٰۃ جب بندے کی طرف سے ہو تو دعا کے معنی میں ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو تو رحمت کے مفہوم میں ہے۔ اسی طرح شکر بندے کی طرف سے اعترافِ نعمت ہے اور خدا کی طرف سے ہماری نیکیوں کی پذیرائی ہے۔ یہی حال توبہ، سخط، مکر، کید، اسف اور حسرت وغیرہ الفاظ کا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ہماری لغت کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم اس فرق کے لحاظ کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرتے ہوں، ہم تمام الفاظ میں یہی کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرتے وقت ان کے صرف انہی مفاہیم کو سامنے رکھتے ہیں جو خدا کی ذات برتر کے شایانِ شان ہوں۔ بعینہٖ یہی طریقہ ہم نے قسم میں اختیار کیا۔ اس کے مختلف پہلوؤں میں سے جو پہلو ہم کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے مناسب نظر آیا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

هُوَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔

۲۔ حمل نظیر علی النظیر اور تفسیر آیات بالآیات کا اصول بھی اس کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کبھی تو دلائل و آیات کو سیدھے سادے اسلوب پر بیان کرتا ہے اور کبھی ان کے لیے قسم کا اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور مقصود دونوں صورتوں میں اہل نظر کے سامنے شہادت پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (البقرہ - ۱۶۴)	آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن کی آمد و شد اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے نفع رساں سامان لے کر سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس سے زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد شاداب کیا اور اس میں طرح طرح کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور آسمان و زمین کے درمیان مسخر بادلوں میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں اور ان سب کا مقصود استشہاد و استدلال ہے۔ پھر غور کرو گے تو دیکھو گے کہ بعینہٖ یہی چیزیں ہیں جن کو قرآن نے بطریق قسم شہادت میں پیش کیا ہے۔ قسم والی آیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھو وہ کیا چیزیں ہیں؟ آسمان، زمین، سورج، چاند، رات، دن، فجر، وقت چاشت، ہوا، ابر، پہاڑ، سمندر، شہر، انسان، باپ، بیٹا، نر، مادہ، جفت، طاق وغیرہ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو سادہ اسلوب میں بطور دلیل و شہادت پیش کی جاتی ہیں، پس ان کے دلیل ہونے کے ثبوت میں خود قرآن مجید کے نظائر موجود ہیں اس لیے ان کو تعظیم کے مفہوم میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

۳۔ خود مقسم بہ بھی اس دعوے کی تائید کرتا ہے کیونکہ کوئی عاقل ایک لمحے کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی پیدا کی ہوئی بعض چیزوں کو ایک معبود و مقدس کی حیثیت دے دے گا، بالخصوص جب کہ چیزیں بھی ایسی ہوں جن میں تقدس کا کوئی خاص پہلو موجود نہ ہو۔ مثلاً دوڑنے والے گھوڑے، غبار اڑانے والی آندھی، وغیرہ وغیرہ اور اس کے برعکس قرآن نے ان تمام چیزوں کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ سب مطیع و محکوم اور خلق کی نفع رسانی کے لیے مسخر ہیں۔ پس مجرد ان چیزوں کی قسم کھانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کو محض بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ مقسم بہ اور مقسم علیہ میں بالعموم نہایت واضح مناسبت موجود ہوتی ہے۔ قرآن نے ان قسموں کو ایسے قالب میں پیش کیا ہے کہ صاحب نظر بادنیٰ تامل مقسم علیہ کے ساتھ ان کے تعلق کو پا لیتا ہے۔ صاحب تفسیر کبیر قسم کو تعظیم کے لیے سمجھتے ہیں چنانچہ اسی خیال کے ماتحت انھوں نے انجیر و زیتون کے فضائل بیان کرنے میں زور قلم صرف کیا ہے۔ تاہم سورۂ ذاریات کے شروع میں جو قسمیں وارد ہیں ان کے اندر دلیل و شہادت ہونے کی ایک جھلک ان کو بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ

انها كلها دلائل اخرجها فی صورة الايمان۔	یہ سب دلائل ہیں جو بصورت قسم پیش کیے گئے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر امام رازی قرآن کی ان تمام قسموں پر جو استدلال کے لیے آئی ہیں، غور کرتے تو وہ سب میں شہادت ہی کے پہلو کو ترجیح دیتے۔

۵۔ جس طرح کی تعمیم قرآن مجید میں عام آیات و دلائل کے بیان کے سلسلے میں ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کی تعمیم و وسعت بعض جگہ مقسم بہ میں بھی موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا	سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی جس کو تم دیکھتے ہو

لَا تُبْصِرُوْنَ۔ (الحاقہ ۳۸-۳۹)
اور اس چیز کی جس کو تم نہیں دیکھتے۔

اس قسم میں جملہ کھلی چھپی چیزوں کو سمیٹ لیا ہے اور یہ وہی تعمیم ہے جو

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔ (الاسراء ۴۴)
نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی تسبیح کرتی ہے حمد کے ساتھ

میں ہے اور اسی تعمیم سے ملتی جلتی بات یہ ہے کہ جہاں قسم کھائی ہے وہاں متقابل چیزوں کا ذکر کیا ہے یعنی روز اور شب، زمین اور آسمان۔ پس کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی اس عموم کے ساتھ تعظیم فرمائی ہو۔ البتہ ان کو دلیل و شہادت کے طور پر ذکر کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ پس اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔

۶۔ بعض جگہ مقسم بہ کے بعد ایسی تنبیہات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اہل نظر کے سامنے بطور دلیل و شہادت پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً

وَالْفَجْرِ وَلَیَالٍ عَشْرٍ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ (الفجر ۱-۵)
شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق اور رات جب ڈھل چلے کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لیے۔

اس میں آخری ٹکڑا هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ (کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لیے) بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسی کہ بالعموم دلائل کے ذکر کے بعد قرآن میں آتی ہے۔ مثلاً سورہ نحل میں بہت سے دلائل کے بعد فرمایا:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۱۲)
اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے

سورہ طٰہٰ میں ہے:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى (۵۴)
بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اہل عقل کے لیے

آل عمران میں ہے:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۱۳)
بے شک اس میں سامانِ عبرت ہے اہل بصیرت کے لیے۔

اسی عام اسلوب کے مطابق سورۂ فجر میں بھی قسمیں کھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ان قسموں کے اندر اہل عقل و بصیرت کے لیے بہت سے دلائل پوشیدہ ہیں۔

سورۂ واقعہ کی تنبیہ بھی اسی سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ فرمایا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ (۷۵-۷۶)
سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈھلنے اور ڈوبنے کی جگہوں کی اور بلاشبہ یہ ایک عظیم الشان قسم ہے اگر تم لوگ جانو۔

یعنی اس میں بہت بڑی دلیل اور ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قسم کی بڑائی کی تصریح فرمائی ہے، مقسم بہ کی عظمت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

۷۔ بالعموم مقسم بہ کا ذکر ایسے صفات کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس سے استدلال مترشح ہوتا ہے۔ مثلاً

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى۔
شاہد ہے ثریا جب مائل ہو۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (التکویر ۱۵-۱۶)
سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے چلنے والے (ستاروں) کی۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝ فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًا (الصّٰفّٰت ۱-۳)
قسم ہے ان کی جو صف باندھتے ہیں پھر ڈانٹتے ہیں پھر ذکر کی تلاوت کرتے ہیں۔

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (الذاریات ۱-۴)
قسم ہے ہواؤں کی جو اڑاتی ہیں غبار پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ کو۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامۃ)
اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔

غور کرو تاروں کا گرنا اور پیچھے ہٹنا۔ ملائکہ کی صف بندی۔ ہواؤں کی غبار انگیزی اور تقسیم امر، نفس کی ملامت گری، ان باتوں کا استدلال سے زیادہ تعلق ہے یا تعظیم سے!

۸۔ بعض مقامات میں ایسا ہے کہ مقسم بہ سے پہلے عام دلائل و آیات کا ذکر ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد مقسم بہ ایسے انداز سے آیا ہے کہ انگلی اٹھا کر تمام پچھلی دلیلوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ گویا استدلال کا جو پہلو مدنظر تھا اس کی تمہید پہلے ہی سے جما دی گئی تھی۔ ایسے مواقع نظم قرآن کے طالب کے لیے بڑے نشاط انگیز ہوتے ہیں، اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے۔ سورۂ ذاریات میں فرمایا ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۰-۲۲)
اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی۔ کیا تم دیکھتے نہیں، اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

یعنی آسمان و زمین میں خدا کی پروردگاری اور روز جزا کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل فرمائی ہے، پھر آسمان و زمین کے دلائل جزا کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (الذاریات ۲۳)
پس آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم، یہ بات حق ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو۔

"وہ" سے مراد اس آیت میں جزا ہے۔ جن لوگوں نے یہاں قرآن مراد لیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔

اس قسم پر جم کر غور کرو۔ اس میں تعظیم کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ قسم اللہ تعالیٰ کی کھائی گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں آسمان اور زمین کی نشانیوں سے استدلال کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ مقسم بہ کا ذکر ایسی صفت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جو ماسبق استدلال کی طرف خود اشارہ کر رہی ہے اور چونکہ اس میں تعظیم کا پہلو زیادہ ابھرا ہوا تھا جو ممکن تھا کہ استدلال کے پہلو کو دبا دیتا اس لیے مناسب ہوا کہ استدلال کی تمہید پہلے استوار کی جائے۔

ممکن ہے اس ساری بحث کے بعد بھی کسی کے دل میں یہ خلش رہ جائے کہ جب اصل حقیقت یہ تھی تو پچھلے علماء پر یہ کیوں مخفی رہی؟ اور جو بات آج تک علماء نے نہیں لکھی اس بات پر دل کیسے مطمئن ہو۔ اس شبہے کا جواب ہم انشاء اللہ اگلی فصل میں دیں گے۔

صحیح پہلو کے مخفی رہنے کے اسباب

۱۷۔ پچھلی فصلوں میں علماء کے جو اقوال ہم نے نقل کیے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ قسم کا یہ مفہوم بالکل نیا نہیں ہے۔ البتہ یہ

ضروری ہے کہ اس کے بعض پہلو لوگوں سے مخفی رہ گئے ہیں اس لیے پورے جزم کے ساتھ لوگوں نے اس کو نہیں پکڑا۔ یا تو بعض مواقع پر اس کو بالکل نظر انداز کر دیا یا یہ ہوا کہ اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ بعض دوسرے غلط مفاہیم بھی شامل کر لیے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ مختصراً قسم کے صحیح مفہوم کے مخفی رہنے کے اسباب یہاں بیان کر دیں تاکہ ان حضرات کا عذر واضح ہو جائے۔

۱۔ پہلا سبب یہ ہے کہ بعض مواقع پر مقسم بہ فی نفسہٖ کوئی اعلیٰ چیز تھی۔ مثلاً قرآن، طور، مکہ، سورج، چاند، تارے، عصر، شب، روز وغیرہ ایسے مواقع پر قدرتی طور پر، اول اول لوگوں کے ذہن میں یہی بات آئی کہ اعلیٰ و اشرف چیزوں کی قسم کھانے کا جو عام رواج ہے، یہ قسمیں بھی اسی صنف میں داخل ہیں اور اس خیال کے جڑ پکڑ جانے کے بعد ان کو دلیل و شہادت کے مفہوم میں لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔ اگر کہیں کوئی ایسا مقسم بہ سامنے آیا جس میں مختلف احتمالات نکلے تو ایسے مواقع میں انھوں نے اس احتمال کو ترجیح دے دی جو اس کے شرف کے پہلو کو نمایاں کرتا تھا۔ اس طرح صحیح سمت کی طرف بڑھنے کی راہ خود بخود بند ہو گئی۔ پانی کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو نشیب کی طرف بہتا ہے یہاں کوئی مانع نہ تھا اس لیے طبیعتیں خود بخود اسی عام خیال کے ساتھ بہ گئیں۔

۲۔ ہمارے اہلِ علم کا عام قاعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جو ایک قاعدہ کلیہ کی جگہ حاصل کر سکے۔ ایسے اصول نہیں لیتے جن کا ہر جگہ چلنا مشتبہ ہو۔ قرآن کی قسموں میں یہی صورت تھی۔ دلیل و شہادت کا پہلو کہیں کہیں تو واضح نظر آتا تھا مگر بعض مقامات میں بالکل مخفی بھی تھا۔ اس لیے ان لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ قاعدہ ہر جگہ نہیں چل سکتا اور جب ہر جگہ نہیں چل سکتا تو یہ صحیح نہیں ہے، حالانکہ ایسی صورت میں ان لوگوں کو اپنے قصورِ فہم کا اعتراف کر کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا چاہیے تھا لیکن اعترافِ عجز بالعموم ان حضرات کا طریقہ نہیں۔ نظمِ قرآن کے باب میں بھی ان حضرات سے یہی لغزش ہوئی۔ قرآن میں نظم اکثر مقامات میں بالکل واضح ہے صرف تھوڑے سے مقامات ایسے ہوں گے جہاں واقعی اشکال ہے۔ ایسے مواقع میں ان لوگوں کے لیے صحیح راہ یہ تھی کہ اپنے عجز کا اعتراف کر کے معاملہ کو علمِ الٰہی کے حوالے کرتے جیسا کہ بعضوں نے کیا لیکن ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ان مواقع میں نظمِ قرآن کی نفی کر دی۔ ظاہر ہے کہ یہ نفی نظمِ کلی کی نفی تھی۔ لیکن عوام نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قرآن میں نظم کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، سارا قرآن یکسر پراگندہ اور منتشر ہے۔

ہمارے نزدیک ٹھیک راہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں ہم اس بات کو تلاش کریں جو اولیٰ اور احسن ہے جس کی دلائل سے تائید ہوتی ہو اور شواہد جس کو ترجیح دیتے ہوں۔ قرآن نے یہی راہ ہمارے سامنے پیش کی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (الزمر - ۱۸)

جو لوگ بات کو کان لگا کر سنتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں تو وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور وہی لوگ عقل مند ہیں۔

اور اگر اس کا کوئی پہلو مشکل نظر آئے تو اس کو اپنے علم کی کوتاہی اور اپنی عقل کے قصور پر محمول کریں اور یہ توقع رکھیں کہ دشواریاں بالآخر آسان ہو جائیں گی اور بند دروازے کھل کے رہیں گے۔ کیونکہ علم و تحقیق کا ہر قدم آگے کی طرف بڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ صحیح علم کے طالبوں پر حق کی راہیں کھولتا ہے پس محض اس وجہ سے کہ استدلال و شہادت کا پہلو بعض قسموں میں مخفی ہے، ہمارے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ ہم ایک بالکل مہمل اور غلط رائے قبول کر لیں۔ قرآن مجید کے آیات و شواہد میں دلیل کا پہلو ہر جگہ

ایسا کھلا ہوا نہیں ہے کہ فکر و تامل کی ضرورت نہ پڑے۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کی تصریح کی ہے اور ان میں غور و فکر کی دعوت دی ہے اور کہا ہے کہ صرف وہی لوگ ان کو سمجھ سکیں گے جو ان پر فکر و تدبر کریں گے اور ساتھ ہی عاقل اور خدا سے ڈرنے والے ہوں گے لیکن باوجود اس کے ہمارا نہایت مضبوط ایمان و یقین ہے کہ قرآن کی یہ تمام دلیلیں نہایت محکم اور قطعی ہیں۔ پس فکر و تامل کی راہ میں پہلا قدم در اصل یہ تلاشِ حق کا داعیہ ہے اور اس کے بعد عقل کو کام میں لانا یہاں تک کہ تمام اشکالات کی گرہیں کھل جائیں۔ اور قلب طمانیت اور شرحِ صدر کے نور سے جگمگا اٹھے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ رائے میں نے تمام قسموں پر غور کرنے کے بعد اس وقت قائم کی جب یہ بات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھول دی کہ یہ سب دلائل و شواہد ہیں اور قرآن نے خود اس حقیقت کی طرف رہبری کی جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

۳۔ تیسرا سبب جو قسم کے اصلی پہلو کے مخفی رہنے کا باعث ہوا اور جس پر اگلوں نے سب سے زیادہ اعتماد کیا یہ ہے کہ انھوں نے دیکھا قسمیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سے ان کو گمان ہوا کہ قسم کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اس رائے کو قائم کر لینے کے بعد جب ان کے سامنے دوسری چیزوں کی قسمیں آئیں تو انھوں نے ان کو مجاز پر محمول کر دیا اور پھر یہ خیال کیا کہ مجاز کی راہ اسی وقت اختیار کرنی چاہیے جب حقیقت کی راہ مسدود ہو۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔ نہ تو کسی چیز کی کثرت اس کے اصل و حقیقت ہونے کی دلیل ہے اور نہ مجاز کو اختیار کرنا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ حقیقت کو اختیار نہ کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ صحیح راہ یہ ہے کہ اس معنی کو قبول کیا جائے جو زیادہ خوبصورت اور سیاق و سباق سے زیادہ لگتا ہوا ہو۔ نیز کلامِ عرب کے اندر اس کے شواہد و نظائر موجود ہوں۔

الغرض جب ان لوگوں نے فرع کو اصل کی جگہ دے دی تو اشیاء کی قسم کا اصلی مفہوم (یعنی شہادت اور استدلال) ان کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ باقی کہیں کہیں جو یہ حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں قسم دلیل ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان مواقع پر دلیل و شہادت کا پہلو اس قدر واضح ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے۔ گویا ان مواقع میں قرآن نے ہاتھ پکڑ کر صحیح مفہوم کی طرف ان کی رہنمائی کر دی ہے تاہم سابق خیال ان کے دل کے اندر اس قدر راسخ ہے کہ اتنی قوی شہادتوں کے بعد بھی طبیعت کا اصلی رجحان اسی طرف رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخفی رہنے کا اصلی سبب درحقیقت قرآن نہیں ہے بلکہ اس کا سبب خود ان کے بعض ذاتی خیالات ہیں جن سے قرآن کو کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی لغزش کو معاف فرمائے۔

۴۔ چوتھا سبب یہ ہے کہ بعض بعض واقعات جو اپنے اندر مختلف پہلو رکھتے تھے۔ وہ کبھی ایک ہی پہلو سے زیادہ مشہور ہو گئے اور اس شہرت نے ان کے دوسرے پہلو آہستہ آہستہ سامنے سے اوجھل کر دیے۔ مثلاً فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کے متعلق مشہور روایت یہی ہے کہ وہ سمندر کے پانی کے ذریعے سے ظہور میں آئی، ہوا کے تصرفات کو اس میں کوئی دخل نہ تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اصلی دخل ہوا کو تھا۔ بعینہٖ یہی نوعیت قومِ نوحؑ کے عذاب کی ہے۔ اس کے متعلق بھی عام زبانوں پر چڑھی ہوئی بات یہی ہے کہ ان کو پانی کے طوفان نے تباہ کیا حالانکہ ان کی تباہی بھی ہوا کے عجائب تصرفات کا کرشمہ ہے ان حقائق کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے قسم اور مقسم بہ کی باہمی مناسبت کے اصلی پہلو پردۂ اخفا میں رہ گئے اور استدلال و شہادت کی تمام بلاغت غارت ہو گئی۔ اور چونکہ ان قصوں کو عقائد و احکام سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے ہمارے علماء نے

ان کی تحقیق و کاوش میں پڑنا کچھ ضروری نہیں خیال کیا۔

(۵) پانچواں سبب چوتھے سبب سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے علماء کی توجہ وقت کے مقبولِ عام اور مروج عقلی و نقلی علوم نے اپنی طرف جذب کرلی جس کی وجہ سے ان لوگوں کو بعض ایسے علوم کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی جو تفسیر میں ان مروجہ علوم سے زیادہ کارآمد تھے۔ مثلاً ان زبانوں کا علم جن میں قرآن اور دوسری مذہبی کتابیں نازل ہوئیں یا سامی قوموں اور ان کے ادب اور لٹریچر کی تاریخ لیکن چونکہ یہ چیز تنہا قسم ہی کے مسئلے سے تعلق نہیں رکھتی اس لیے ہم یہاں اس کی تفصیل میں زیادہ نہیں پڑنا چاہتے اور اسباب خفا پر بھی اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں اس لیے اس فصل کو ہم تمام کرتے ہیں۔

قسم کی بلاغتیں

۱۷۔ ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ اگر یہ قسمیں دلیل ہیں تو ان کو دلیل کے صاف، اسلوب میں کیوں نہیں پیش کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ استدلال کی مختلف حالتیں ہیں۔ بعض مرتبہ استدلال ایسے امور پر ہوتا ہے جن میں نفرت، یا رغبت، کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اس کی نہایت واضح مثالیں علوم طبیعی، ریاضی یا بالعموم تاریخ میں مل سکتی ہیں۔ ایسے مواقع پر بلاشبہ استدلال کا صاف اور واضح اسلوب، ہی موزوں ہوسکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات استدلال کا تعلق ایسے نفسیاتی امور سے ہوتا ہے جن میں متکلم و مخاطب دونوں طرف سے ترغیب و انکار، زجر و اعراض اور ضد و اصرار کی ایک خاص کشاکش ظہور میں آجاتی ہے۔ ایسے مواقع میں ضرورت پیش آتی ہے کہ دلیل کو مختلف صورتوں اور بھیسوں میں پیش کیا جائے اور کلام کے ایسے ڈھب اختیار کیے جائیں جو وضاحت و لطافت اور قوت و شدت کے اعتبار سے متفاوت ہوں، یہی نکتہ ہے کہ بعض مرتبہ اسلوبِ کلام بدل دیا جاتا ہے تاکہ مخاطب ایک ہی انداز کی گفتگو سے بے مزہ نہ ہو اور اگر ایک اسلوب کلام اس پر مؤثر نہیں ہوتا تو دوسرا اختیار کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ کچھ کارگر ہو۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (الانعام - ۶۵)
غور کرو کس طرح ہم اپنی آیتیں ہیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس بادشاہ سے مجادلہ کیا تھا، اس کے ساتھ بھی آپ نے یہی انداز اختیار کیا۔ جب دیکھا کہ جو دلیل انھوں نے مخاطب کے سامنے پیش کی ہے، اس کو وہ نہیں سمجھ رہا ہے، انھوں نے اس کو ترک کر کے فوراً دوسری دلیل اختیار کرلی اور پہلی دلیل پر اصرار مناسب نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معترض اس دوسری دلیل کے سامنے بے بس ہو کے رہ گیا۔

یہ شبہے کا اجمالی جواب ہوا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اسلوب قسم کے اندر محاسن بلاغت کے جو گوناگون پہلو موجود ہیں ان میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کریں۔

۱۔ اس اسلوب سے قول کی پختگی اور تاکید کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں رسولوں کا قول مذکور ہے۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ وَمَا
کیا ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں

عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (یٰس - ۱۶-۱۷)
اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر کھلے طور پر پہنچا دینا۔

سورۂ طارق میں ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۱-۱۴)
اور شاہد ہے آسمان پرنگار اور زمین پرشگاف کہ یہ دو ٹوک بات ہے اور ہنسی مسخری نہیں ہے۔

اور عرب اس بات کو جانتے تھے کہ ایک شریف انسان جب کسی بات پر قسم کھاتا ہے تو اس سے اس کا مقصود بات کی سچائی اور واقعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل نبوت میں قسمیں زیادہ ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے معاملے کی اہمیت اور سنجیدگی پوری طرح واضح ہوجائے اور یہ چیز خود اسلوب قسم کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں تعظیم کا کوئی پہلو ہوتا ہے۔ جس طرح اثبات یا انکار کی تاکید کے لیے اکثر زبانوں میں استفہام یا تعجب کا اسلوب لاتے ہیں۔ یا تعجب کی تاکید کے لیے ندا، کا اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً "یا للماء" "یا لقومی للشباب المبکر" اسی طرح قسم کے اسلوب کی یہ لازمی خصوصیت ہے کہ اس سے قول کی پختگی اور سنجیدگی کا اظہار ہو۔

۲۔ اسلوب قسم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انشاء کی صورت میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے مخاطب کو اس میں تردید و انکار کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ وہ جواب قسم کا آسانی سے انکار کرسکتا ہے کیونکہ وہ خبر کی صورت میں ہوتا ہے لیکن نفس قسم کا انکار نہیں کرسکتا کیونکہ وہ انشاء کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہی حالت صفت کی بھی ہوتی ہے، وہ ایسی صورت میں سامنے آتی ہے کہ سامع کو اس کے رد و انکار کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ ان دونوں صورتوں میں انشاء کا رنگ محض ظاہری ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں اسلوب خبری ہیں۔ اور قرآن مجید کی بعض قسموں میں تو یہ دونوں قسم کی خبریں جمع ہوگئی ہیں، مثلاً والقرآن المجید والیوم الموعود، فالمقسمٰتِ اَمْرًا، فالفارقات فرقاً، والصافات صفاً۔ چنانچہ اگر ان کی تشریح کی جائے تو ان میں سے ہر جملہ خبریہ جملوں کی شکل میں ڈھل جائے گا۔ مثلاً والصافات صفاً کا مطلب ہوگا ملائکہ غلاموں کی طرح صف بستہ ہیں فالمقسمٰت امرا اور فالفارقات فرقاً کا مطلب ہوگا کہ ہوائیں خدا کے حکم سے فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ والقرآن المجید کا مطلب ہوگا کہ یہ قرآن برتر کلام ہے۔ والیوم الموعود کا مطلب ہوگا کہ ان کے محاسبے کے لیے ایک روز مقرر ہے۔ پس یہ گویا خبریں ہیں جو صافات اور فارقات، وغیرہ میں اندر چھپا دی گئی ہیں اور نیز چونکہ قسم کا اسلوب ہے اس لیے ان اشیاء کا شہادت اور دلیل ہونا مزید برآں ہے اور اس پہلو سے گویا اس میں دہری خبریں چھپی ہوئی ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جہاں کہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ مخاطب ہوشیار ہو کر انکار کا ترکش سنبھال لے گا وہاں یا تو خطاب کا رُخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔
قرآن حکیم کی قسم تم خدا کے فرستادوں میں سے ہو۔

یا جواب قسم کو، جس کا جملہ خبریہ کی شکل میں ہونا ناگزیر ہے، حذف کر دیا جاتا ہے اور صرف مقسم بہ پر اکتفا کر کے اس کے بعد کوئی ایسی بات لائی جاتی ہے جو محذوف پر دلیل ہو، تاکہ مخاطب کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ وہ انشاء کو خبر کی صورت میں ڈھال کر اس کے تردید و انکار کے لیے آمادہ ہو۔ اس وقت وہ قسم کے بعد کی بات سننے کے لیے کان لگاتا ہے تاکہ اس کی

تردید کرسکے لیکن دفعتہً اس کے سامنے ایک ایسی بات آجاتی ہے جس کا مقصود اس استدلال کو قوت پہنچانا ہوتا ہے جو سابق کلام میں پیش نظر تھا۔ مثلاً

صٓ، وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ (ص۔ ۱-۲)	پُرنصیحت قرآن کی قسم، بلکہ کافر گھمنڈ اور عناد میں مبتلا ہیں۔

اس آیت کو دیکھو صرف جملہ انشائیہ پر اکتفا کیا، جملہ خبریہ نہیں لائے۔ قسم کے ساتھ جو صفت مذکور تھی گویا وہی خبر کی قائم مقام ہوگئی۔ یعنی پوری بات یوں ہوئی کہ قرآن مجید شاہد ہے کہ وہ ان کے لیے یاددہانی اور نصیحت ہے: اس کے بعد ان کے بعض ایسے خصائل کا ذکر کیا جس سے ان کو انکار نہیں تھا بلکہ ان پر فخر کرتے تھے، اور واضح کردیا کہ ان کا یہ اعراض محض حمیت جاہلیت اور عناد کا نتیجہ ہے۔

اسی سے مشابہ سورۂ قٓ کی قسم ہے۔

قٓ، وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ، بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ (۱-۲)	قرآن بزرگ کی قسم، بلکہ ان کو تعجب ہے کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک ہوشیار کرنے والا آیا۔ پس کافروں نے کہا یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔

یعنی قرآن مجید شاہد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت کھلے لفظوں میں بعث کی خبر دینے والا ہے لیکن وہ صرف اس وجہ سے اس کے منکر ہیں کہ ان کی نظر میں یہ بات عجیب ہے کہ اس کی خبر دینے والا انھیں کے اندر کا ایک آدمی ہے۔

ہاں اگر قسم ایسی ہے کہ مخاطب کو اس سے انکار نہیں ہے تو ایسے مواقع پر جواب قسم کو حذف نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً:

حٰمٓ، وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ، اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (الزخرف ۱-۳)	شاہد ہے واضح کتاب، بلاشبہ ہم نے بنایا اس کو عربی قرآن تاکہ تم لوگ سمجھو۔

اس میں قسم کے ساتھ واضح اور کھلی ہوئی ہونے کا ذکر کیا ہے، اور جواب میں اس کے قرآن عربی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن میں سے کسی سے بھی ان کو انکار نہیں تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہاں قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کو علیحدہ دعوے کی شکل میں نہیں پیش کیا کیونکہ یہ بات خود کلام کے اندر مضمر ہے جب کہ اس نے کلام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے انکار کی طرف مخاطب کو توجہ نہیں ہوسکتی۔ یہاں اگر موضوع کے حدود سے باہر نکل جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو جواب قسم کے حذف کے مواقع اور اس کے فوائد پر ہم تفصیل سے بحث کرتے۔ لیکن قسموں کے تحت بھی ان سے تعرض کرنا مناسب ہوگا۔

۳۔ اس اسلوب کی تیسری خوبی استدلال کے لیے اس کی موزونیت ہے۔ اس اسلوب میں اختصار ہوتا ہے اور جب الفاظ کم ہوں تو مفہوم تمام حجابات سے مجرد ہوکر سہولت سے سامنے آجاتا ہے اور اس سے اس کی تاثیر اور زور میں اضافہ ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ استعارہ کبھی کبھی بلاغت میں تشبیہ پر فوقیت لے جاتا ہے۔ یہاں ایجاز کے محاسن پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلاغت کی کتابوں میں اس پر مفصل مباحث موجود ہیں۔ بعض معاصرین ادب نے تو ایجاز کی تعریف میں اس قدر

مبالغے سے کام لیا ہے کہ ان کے نزدیک ایجاز بلاغت کا دوسرا نام ہے۔ وہ کلام کے تمام محاسن کا محور اسی کو قرار دیتے ہیں اور اس کی وجہ اس کے تنوعات کی کثرت اور گوناگونی ہے۔ وہ جس راستے سے بھی داخل ہوں اسی دروازے تک پہنچتے ہیں اور جس دروازے کو بھی کھولتے ہیں اسی کا جلوہ ان کے سامنے آتا ہے۔ پس تمام اربابِ بلاغت میں ایسی ایک چیز پر ان کی نگاہ ٹک گئی ہے۔

ایجاز کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے پہلو بہ پہلو متعدد دلائل جمع کیے جاسکتے ہیں اور جب ایک ہی بات پر مختلف پہلوؤں سے استدلال کیا جائے تو قوت و اثر کے لحاظ سے اس کا درجہ بہت بلند ہوجاتا ہے۔ اس کی مثال سورۂ طور، سورۂ بلد اور سورۂ تین کی قسموں میں مل سکتی ہیں۔ اگر ان قسموں کی تفصیل کردی جائے اور ان کے اندر جو دلائل مضمر ہیں ان کو پوری طرح کھول دیا جائے تو کلام کا تمام نظم پراگندہ اور منتشر ہوجائے گا۔ بعینہٖ یہی بات ہم سورۂ فجر، سورۂ والشمس اور سورۂ واللیل کی قسموں میں پاتے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عرب اپنی ذہانت اور احساسِ برتری کی وجہ سے دوسری قوموں کے مقابل میں ایجاز کو زیادہ پسند کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے معانی و مطالب اس کے الفاظ سے زیادہ نہ ہوں۔ اگر کوئی بات کسی پہلو سے نسبتاً پھیلاؤ کے ساتھ بیان ہوتی ہے تو وہی بات دوسرے پہلوؤں سے ایجاز و اختصار کی خوبیاں بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید کے عجائب و اسرار کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

۴۔ اسلوبِ قسم کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل کے ڈھونڈھنے میں سامع خود متکلم کے ساتھ شریک ہوتا ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر عناد و اختلاف کا داعیہ کمزور پڑجاتا ہے۔ انسانی طبیعت کی یہ خصوصیت ہے کہ جب کوئی حقیقت اس کے سامنے غور و تامل کے بعد آتی ہے تو اس سے اس کو خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔ برعکس اس کے اگر متکلم سامع کو اپنے بیان کی وضاحت سے منفعل و مرعوب کردے تو یہ چیز اس کی طبیعت پر ایک قسم کا بوجھ بن جاتی ہے اور خوشی کے بجائے اس میں ایک قسم کی تکان اور انقباض کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور یہ بھی اس صورت میں جب کہ مخاطب کو متکلم کی رائے سے اختلاف نہ ہو۔ اور اگر اختلاف ہو تو اس کا نتیجہ اور بھی مہلک ہوتا ہے۔ اس شکل میں وہ اس سے بالکل بے زار ہوکر اپنے کان ہی بند کرلیتا ہے۔

کلام میں بسا اوقات خبر کے بجائے استفہام کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے اس کا مقصد بھی عموماً سامع کو استنباطِ دلیل میں شریک کرنا ہوتا ہے "الاتری ذلک" اور "هل سمعت هذا" وغیرہ اسالیب بیشتر اسی مقصد سے استعمال ہوتے ہیں۔ خطبۃ الوداع میں اس طرح کے استفہام کی نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔ آپ نے پوچھا ای بلد هذا، ای شهر هذا، ای یوم هذا؟ "یہ کون سا شہر ہے، کون سا مہینہ ہے، کون سا دن ہے؟" ان تمام سوالات کا مقصد صرف یہ تھا کہ سامعین کو بات سننے کے لیے پوری طرح آمادہ کردیا جائے۔ قرآن مجید نے سورۂ فجر میں یہ دونوں بلیغ اسلوب ایک جگہ جمع کردیے ہیں۔ پہلے بعض ایسی چیزوں کی شہادت پیش کی ہے جو عقل انسانی کو ابھارتی ہیں کہ وہ ان کے اندر سے اللہ تعالیٰ کی تدبیر و تقدیر اور اس کے عدل کی دلیلیں استنباط کرے۔ اس کے بعد فرمایا ہے

هَلْ فِیْ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ (۵)	کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لیے۔

اسی کے مشابہ سورۂ طارق کا اسلوب ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۱-۳) — آسمان اور شب آہنگ کی قسم اور تو کیا جانے کہ شب آہنگ کیا ہے، وہ دمکتا ستارہ!

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ استدلال میں ماہر ہوتے ہیں وہ مخاطب کو بغیر اس کی رائے کا تخطیہ کیے ہوئے نہایت آسانی سے اصل دعویٰ تسلیم کرا دیتے ہیں اور مخاطب سمجھتا ہے کہ وہ اس نتیجے تک بغیر کسی رہبری کے خود بخود پہنچ گیا ہے۔ تعریض کے مقابل میں کنائے کے بلیغ ہونے کا راز بھی بیشتر یہی ہے۔

قرآن مجید کی قسموں پر غور کرنے والے کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ ان میں پہلے کوئی ایسی بات سامنے آتی ہے جو انسان کو عقل کے استعمال پر آمادہ کرتی ہے اور پھر وہ اصل دعوے کی طرف نہایت لطافت اور تدریج کے ساتھ رہنمائی کرتی ہیں۔ مثلاً سورۂ ذاریات میں پہلے ذاریات (غبار اڑانے والی ہوائیں) کی قسم کھائی اس کے بعد آہستہ آہستہ فرمایا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (وہ حکم الٰہی کو تقسیم کرتی ہیں) سورۂ مرسلٰت میں پہلے تیز ہواؤں کے چلنے کی قسم کھائی اس کے بعد درجہ بدرجہ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا، فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا، عُذْرًا اَوْ نُذْرًا، (پھر پھاڑتی ہیں، پھر یاد دلاتی ہیں، الزام اتارنے کو یا ڈرسنانے کو) تک پہنچے۔ اگر شروع ہی میں یہ بات کہہ دی جاتی کہ ہوائیں نیکوکار اور بدکار قوموں میں فرق کرتی ہیں تو مخاطب اس کا انکار کر بیٹھتا۔

۵۔ اس اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ دلیل اپنی معروف صورت سے ایک بالکل مختلف صورت میں سامنے آتی ہے۔ جس کے سبب سے منکر کو مناظرہ کرنے اور جھگڑنے کی راہ نہیں ملتی، اوپر ہم نے دوسری خصوصیت بیان کرتے ہوئے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے یہ بات اس سے مختلف ہے، وہ بات صرف اس اسلوب کے انشائی ہونے کا نتیجہ ہے اور اس سے صرف مخاطب کے انکار کا سدباب ہوتا ہے اور یہ پہلو جس کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں، سرے سے جھگڑے اور مناظرے کی راہ بھی بند کر دیتا ہے اور صرف انشاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ خبر کی صورت میں باقی رہتا ہے، مثلاً:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (العصر ۱-۲) — زمانہ گواہی دیتا ہے کہ آدمی گھاٹے میں ہے۔

اس کو اگر تم خبر کی صورت میں ڈھال دو جب بھی اس میں اور صریح استدلال کے اسلوب میں کچھ نہ کچھ فرق باقی رہے گا۔ مثلاً اسی بات کو صریح استدلال کے اسلوب میں یوں کہیں گے کہ "انسان گھاٹے میں ہے کیونکہ زمانے کی تیز روی ہر لمحہ عمر کو کم کر رہی ہے۔" یہ استدلال ہر چند نہایت واضح اور صحیح ہے لیکن مخالف، جو مجادلے کا خوگر ہے، اس میں آسانی کے ساتھ جھگڑے کی راہ پیدا کر لے گا یا کم از کم اس نتیجے سے انکار کر دے گا جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ایمان اور عمل صالح پر اعتماد، وہ فوراً بول اٹھے گا کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ انسان بڑے نفع میں ہے کیونکہ وہ اسی چند روزہ حیات فانی کے بدلے جس کا فنا ہونا ناگزیر ہے، بہت سی لذتیں اور آرزوئیں حاصل کر لیتا ہے۔" یا یہ کہہ دے گا کہ "جب اس زندگی کو فنا ہی ہونا ہے تو ع این قدرے بعیش غرق نہ باید ساقی۔" چنانچہ امراء القیس، جو اپنی شوریدہ مزاجی اور رندی کی وجہ سے الملک الضلیل کے لقب سے مشہور ہوا، کہتا ہے:

تمتع من الدنیا فانک فان
من النشوات والنساء الحسان

دنیا کی لذتوں، شراب اور نازنینوں سے متمتع ہو لو کیونکہ بالآخر تمہیں فنا ہونا ہے۔

یہ دلیل کتنی ہی کمزور اور مہمل ہو لیکن جب بحث و مناظرہ کا دفتر ایک دفعہ کھول دیا جاتا ہے تو اس کو آسانی سے سمیٹا نہیں جا سکتا۔ اور بات جتنی ہی کھلتی جاتی ہے معترض کی کج بحثی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے پس اکثر حالات میں بہتر یہی ہوتا ہے کہ بحث و مناظرہ کے پہلو سے گریز کیا جائے کیونکہ شہ دینے سے یہ چیز اور زور پکڑتی ہے۔ بالخصوص عربوں کا حال اس معاملے میں بہت قابل لحاظ تھا۔ قرآن مجید نے جابجا ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً:

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (الزخرف ۵۸) — یہ مثال انھوں نے تمہارے سامنے نہیں پیش کی ہے مگر محض جھگڑنے کے لیے۔ یہ بڑے جھگڑالو لوگ ہیں۔

ایک جگہ اور ان کو صاف صاف جھگڑالو قوم (قَوْمًا لُّدًّا) کہا ہے۔

اصلی قابل لحاظ چیز ان دونوں فصلوں کے اندر قسم کے وہ لطیف دلائل ہیں جو ایک طرف تو انکار اور بحث کا سدباب کرتے ہیں اور دوسری طرف طبیعت انسانی کے اندر فکر و استنباط کی تخم ریزی کرتے ہیں۔

۶۔ جن سورتوں کے شروع میں قسمیں پائی جاتی ہیں، اہل ذوق جانتے ہیں کہ ان قسموں نے ان کو حسن و خوبروئی کا ایک عنوان جمال بخش دیا ہے۔ سورتوں کے اوائل میں یہ قسمیں اس طرح چمکتی ہیں جس طرح انگشتری میں نگینہ۔ بعض جگہ سورتوں کے بیچ میں بھی قسمیں آئی ہیں، لیکن کم، مگر جہاں کہیں آئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مطلع قصیدے کے بیچ میں آگیا ہو۔ قسم کا مقصود زیبائش کلام یقیناً نہیں ہے لیکن جب یہ آغاز کلام کے لیے موزوں سمجھی گئی تو اس کے لیے وہ تمام لوازم تصویر اختیار کیے گئے جو اگر دیباچۂ مضمون میں مصور ہو سکیں تو دلوں کو مبہوت اور نگاہوں کو خیرہ کر دیں۔ یہ حقیقت محتاج اظہار نہیں ہے کہ تمام اسالیب کلام میں سے مصوری کے لیے قسم سے زیادہ موزوں کوئی اسلوب نہیں ہے کیونکہ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں گویا اس کو ایک گواہ بنا کر مخاطب کے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ سورتوں کے اوائل نادر و بوقلموں تصویروں سے مزین ہوں تو ان کو خاص خاص قسموں سے شروع کیا۔ یہ تصویریں مختلف قسم کی ہیں۔ کہیں یہ ایک ہی چیز کی تصویر ہے مثلاً لکھنے والا قلم، دمکتا ستارہ، دوڑنے والے گھوڑے، غبار انگیز ہوائیں، صف بستہ ملائکہ، بعض جگہ یہ تصویریں مختلف چیزوں کی ہیں۔ لیکن ایک جامع رشتے نے ان سب کو ایک البم میں جمع کر دیا ہے۔ مثلاً تین، زیتون، طور سینا، بلد امین یا طور، کتاب مسطور، بیت معمور، سقف مرفوع، بحر مسجور۔ یا مثلاً شمس و قمر، لیل و نہار، ارض و سما، اور نفس وغیرہ جو مختلف حالات اور تغیرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور جن سے نہایت اہم حقائق پر دلیل لائی جا سکتی ہے اور ان حقائق پر استدلال ہی جن کا اصلی مقصد ہے اگر یہ فائدہ ان سے حاصل نہ ہو تو عقل کے نزدیک ان کی چنداں اہمیت نہیں ہے، اسلوب کلام کی یہ نادرہ کاریاں محض مخاطب کی تالیف قلب اور دلداری کے لیے اختیار کی جاتی ہیں تاکہ بات کسی طرح اس کے دل کے اندر گھر کرے اور وہ بیزار ہو کر کان نہ بند کر لے۔ اتمام حجت کا اصلی گر یہ ہے کہ انداز دعوت مؤثر اور دل نشین ہو اور مخاطب کا دل مٹھی میں لے لے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو اس اصول کی خاص طور پر تعلیم فرمائی ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کو جب فرعون کے پاس بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ:-

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ - ۴۴) — اس سے نرمی سے بات کرو تاکہ وہ نصیحت پذیر ہو یا ڈرے۔

۷۔ اس اسلوب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل دعوے سے پہلے سامنے آتی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلیل آہستہ آہستہ مخاطب کو اصل دعوے تک کھینچ لاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر مخاطب پہلے سے اصل دعوے کو سمجھ جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ کترا کر دوسری راہ اختیار کرے لیکن اگر وہ دعوے سے بے خبر ہو تو توقع ہوتی ہے کہ وہ سیدھی راہ سے منحرف نہ ہوگا اور جب کے قدم سیدھی راہ پر ہیں وہ انشاءاللہ منزل پر پہنچ کے رہے گا۔ چوتھی اور پانچویں خصوصیات بیان کرتے ہوئے ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کو اس کی مثال میں پیش کر سکتے ہیں۔

۸۔ قسم کلام کی اس قسم میں سے ہے جس کو جوامع الکلم کہتے ہیں یعنی بظاہر تو وہ صرف ایک مختصر سی بات ہوتی ہے لیکن اس کے اندر معانی کا ایک دفتر پوشیدہ ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقسم بہ کے ساتھ استدلال کا پہلو مذکور نہیں ہوتا۔ اگر اس میں استدلال کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کر دیا جائے تب تو اس سے صرف ایک ہی دلیل پیدا ہوگی لیکن جب یہ صورت نہ ہو بلکہ استدلال کے پہلو کو غیر معین چھوڑ دیا جائے تو ایک ہی چیز کے اندر متعدد معانی اور گوناگون پہلو استدلال و استنباط کے ہو سکتے ہیں اور ایک غور کرنے والی عقل اس کے اندر سے بے شمار دلیلیں نکال سکتی ہے۔

یہ بات صرف اسلوب قسم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ قرآن میں عام اسلوب پر بھی جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان کے اندر بھی یہ چیز پائی جاتی ہے۔ قرآن میں کہیں کہیں ایک ہی چیز کو بہت سے دلائل کے استنباط کا محل بنایا ہے۔ مثلاً:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (لقمان - ۳۱) — نہیں دیکھتے کہ کشتی چلتی ہے سمندر میں اللہ کے فضل سے تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے بے شبہ اس میں ثابت قدم رہنے والوں اور شکر گزاروں کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات - ۲۰-۲۱) — اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی کیا تم دیکھتے نہیں؟

زمین اور نفس کے اندر خدا کی قدرت و عظمت اور اس کی رحمت و حکمت پھر توحید، رسالت اور قیامت کی جو دلیلیں ہیں (جن پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب حجج القرآن میں کی ہے) ان کو کون شمار کر سکتا ہے۔

پس جہاں کہیں یہ صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو شہادت کے طور پر پیش کر کے اس کے بعد کسی ایسے مذہبی دعوے کا ذکر کیا ہے جو محتاج دلیل ہے تو اصل مقصود یہی ہے کہ ایک صاحب فکر و نظر اس چیز سے جس قدر دلائل مستنبط کر سکتا ہے کرے اور اگر اصلی دعوے اور نظم کلام کی رعایت ملحوظ رکھ کر ایک چیز کے دلائل میں اختلاف ہو تو اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے کیونکہ عقلوں کے تفاوت کے لحاظ سے دلیلوں کا اختلاف اور ان کا تنوع لازمی ہے۔ قرآن مجید کی تعریف یہی

ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے عجائب خلقت کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے اسی طرح قرآن مجید کے اسرار و حکمت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (لقمان - ۲۷) — اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلم ہو جائیں اور سمندر میں سات سمندر اور مل جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات نہ ختم ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ عزیز و حکیم ہے۔

قرآن کی قسموں میں بلاغت کے جو پہلو ہیں ان میں سے چند یہ بیان ہو سکے ہیں اور اسی پر ہم بس کرتے ہیں۔ ہمارا مقصود استقصاء نہیں ہے اور استقصاء کر بھی کون سکتا ہے؟

اوپر کے مباحث سے قسم کا اصلی مفہوم اور اس کی مختلف صورتیں روشنی میں آگئیں جس سے دو آخری شبہوں کی، جو بہت اہم تھے، جڑ کٹ گئی اور اہم تمدنی امور اور بادشاہوں اور قوموں کے تعلقات و معاملات میں قسم کی ضرورت و اہمیت پر ہم نے جو تقریر چھٹی اور دسویں فصل میں کی ہے اس نے پہلے شبہے کو بھی بے جان کر دیا ہے اب صرف ایک چیز باقی رہ گئی وہ یہ کہ بعض مذہبی صحیفوں میں اس کی ممانعت کیوں وارد ہے؟ آئندہ فصل میں ہم اس سوال کا جواب دینا چاہتے ہیں۔

مستحسن اور غیر مستحسن قسموں کا بیان

۱۸۔ قسم میں بالعموم آدمی یا تو اپنی جان کو شہادت میں پیش کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو، اور یہ دونوں صورتیں آدمی کی عزت اور اس کے مذہب کے نقطہ نظر سے نہایت اہم ہیں۔ پس قسم کے معاملہ میں بے پروائی اور بے احتیاطی کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ بعض حالتوں میں اس کی ممانعت ہوئی اور یہ ممانعت تین مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر وارد ہوئی ہے۔

۱۔ مقسم علیہ کے پہلو سے۔

۲۔ مقسم بہ کی جہت سے۔

۳۔ مقسم علیہ اور مقسم بہ دونوں جہتوں سے۔

مقسم علیہ کے لحاظ سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی ہر چھوٹی بڑی بات پر قسم کھاتا رہتا ہے وہ اپنے اس عمل سے ظاہر کرتا ہے کہ اس کے اندر عزت نفس کا کوئی احساس نہیں ہے پس اس طرح کی قسم کے لیے ممانعت وارد ہوئی اور قرآن نے اس مضمون کو واضح کرنے کے لیے مبالغے کا صیغہ استعمال کیا تاکہ کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ فی نفسہ قسم کوئی بری چیز ہے بلکہ یہ واضح ہو جائے کہ بات بات پر قسم کھانا برا ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ (القلم - ۱۰) — ہر ذلیل لباٹیے کی بات پر کان نہ دھرو۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بات بات پر قسم کھاتا ہے وہ اپنے نفس کو ذلیل کر دیتا ہے چاہے وہ اللہ کی قسم کھائے یا کسی اور کی۔

اس کی مثال اس چھچھورے آدمی کی ہے جو بلا سبب غصے میں آ جاتا ہے یا موقع بے موقع ہنسا کرتا ہے۔

مقسم بہ کے پہلو سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی کوئی مذہبی قسم اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور ذات کی کھاتا ہے تو گویا اس ذات کو معبود کی حیثیت دے دیتا ہے۔ پس شائبہ شرک سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہوا کہ جس طرح غیر اللہ کا سجدہ یا بتوں کا تراشنا ممنوع ہوا (جیسا کہ تورات کے احکام عشرہ کے سلسلے میں مذکور ہے) اسی طرح غیر اللہ کی قسم بھی ممنوع ہو چنانچہ تثنیہ باب ۶۔ ۱۳ میں ہے۔

"تو اپنے خداوند خدا سے ڈرے گا، اسی کو پوجے گا اور اسی کے نام کی قسم کھائے گا۔"

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غیر اللہ کی قسم کی ممانعت فرمائی ہے۔

مقسم علیہ اور مقسم بہ دونوں پہلوؤں سے قسم کے ممنوع ہونے کی صورت یہ ہے کہ آدمی ہر چھوٹی بڑی بات پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا پھرے۔ یہ عزتِ نفس اور تقویٰ دونوں چیزوں سے محرومی کی دلیل ہے اور قرآن نے ایسی ہی قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے کہ "وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ" (البقرۃ - ۲۲۴) (اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ)

قسم کی یہ صورتیں ممنوع ہیں اور ان کے ممنوع ہونے کے اسباب ظاہر ہیں۔ باقی ان کے علاوہ جو قسمیں ہیں ان کے لیے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بالخصوص جو قسمیں تمدنی ضروریات سے وجود میں آتی ہیں، اور جن کو ہم نے چھٹی اور دسویں فصل میں ذکر کیا ہے، وہ خاص اہمیت رکھتی ہیں، اور شریعتِ اسلام میں جو ایک عالمگیر شریعت ہونے کی وجہ سے انسانی فطرت کی کمزوریوں اور تمدنی ضرورتوں کو سب سے زیادہ ملحوظ رکھنے والی شریعت ہے۔ ان کی ممانعت کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ ہماری فطرت کی کمزوریوں اور ہماری ضرورتوں کا جس قدر اہتمام اس شریعت میں کیا گیا ہے۔ اس پر قرآن شاہد ہے۔ مثلاً فرمایا۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ	اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے بوجھ کو ہلکا کرے اور انسان
ضَعِيْفًا (النساء - ۲۸)	کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

پھر ایسی شریعت میں ایک ایسی چیز کے لیے مطلق ممانعت کیسے ہو سکتی ہے جو تمام دینی و تمدنی مہمات میں واحد چارہ کار ہو، یہ ہماری فطرت کی کمزوریوں ہی کا لحاظ تھا کہ ان قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوا جو متکلم بلا کسی مقصد کے عادۃً کھا لیا کرتا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ	اللہ تعالیٰ تمہیں لغو قسموں پر نہیں پکڑے گا بلکہ وہ تمہیں
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ	چیزوں پر پکڑے گا جن کا تمہارے دل ارتکاب کرتے ہیں
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (البقرۃ - ۲۲۵)	اور اللہ تعالیٰ غفور و حلیم ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال کا تعلق دراصل نیت سے ہے، پس لغو قسمیں اگرچہ وقار اور ثقاہت کے بالکل خلاف ہیں لیکن ہمارا پروردگار مہربان اور ہماری کمزوریوں سے درگزر کرنے والا ہے اس وجہ سے اس طرح کی قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں فرمائے گا۔

یہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے عام قسموں کے متعلق ہے۔ رہیں قرآن مجید کی قسمیں تو وہ بیشتر استدلال کے لیے ہیں اور استدلال میں وقار یا دین کے مجروح ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ پھر یہ قسمیں یا تو توحید پر کھائی گئی ہیں یا معاد پر یا رسالت پر۔

اور ان امور کی عظمت و اہمیت مسلم ہے۔ ان چیزوں پر قسم کھانے کی وجہ سے کسی کے دین و وقار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی قطعیت بالکل غیر مشتبہ ہے، ان میں کسی جھوٹ کا احتمال اور کذب کا شائبہ نہیں ہے۔ جن چیزوں پر خود اللہ تبارک و تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور تمام اہلِ علم کی گواہی ثبت ہو اس پر ایک بندہ اللہ کی گواہی پیش کر کے اپنی دینداری کے بارے میں کیسے مشتبہ ہو سکتا ہے! اس طرح کی قسمیں تو شہادت کے اس حقیقی مفہوم کی تعبیر ہیں جس کی انبیائے کرام نہایت واضح لفظوں میں تبلیغ کرتے ہیں۔ انبیائے کرام اپنی دعوت و تبلیغ میں کیا دعویٰ کرتے ہیں؟ یہی نا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ ان کو مبعوث کیا۔ وہ ان کی صداقت کا گواہ ہے۔ وہ اسی کے دامنِ رحمت میں پناہ لیتے ہیں، اسی پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنے قول پر اسی کو گواہ ٹھہراتے ہیں، یہ ساری باتیں تو بعینہٖ وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قسم سے سمجھی جاتی ہیں جیسا کہ دسویں فصل میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ پھر کیا حرج ہے اگر صورت بدل کر ان چیزوں کو قسم کے اسلوب میں پیش کر دیا جائے۔ اور یہ معلوم ہے کہ جب قسم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخلوقات اور کلمات کی ہو تو شرک کا کوئی احتمال نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح کی قسموں کا مفہوم صرف شہادت ہوتا ہے۔ ان میں تعظیم کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔

الغرض قرآن مجید کی قسموں کی ایک خاص نوعیت ہے اور انبیاء و صلحاء نے جو قسمیں کھائی ہیں ان کا مقصود اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل کا اظہار ہے۔ پس جو لوگ ان قسموں پر اعتراض کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ قسم کھانا علی الاطلاق ممنوع ہے، وہ محض قلتِ تدبر کی وجہ سے ایک سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

معاملے کی صحیح شکل یہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ اب ہم چند لفظوں میں اس ممانعت پر بھی روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جو حضرت مسیح کی طرف منسوب ہے۔ ہمارے نزدیک اس ممانعت کی خاص وجہ ہے اور اس کی تشریح فائدے سے خالی نہیں۔

انجیل میں قسم کھانے کی ممانعت اور اس کی توضیح

۱۹۔ ہمارے علماء کا یہ دعویٰ ہے اور مسیحی علماء بھی اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ اصل انجیل مفقود ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں آج جو چیز انجیل کے نام سے موجود ہے اس کی حیثیت محض ترجمے کی ہے۔ جس میں مسیح علیہ السلام کے اقوال کے ساتھ ساتھ انجیل کے راویوں کے اقوال بھی خلط ملط ہیں اور یہ روایتیں باہم دگر مختلف بلکہ بعض جگہ بالکل متضاد ہیں۔ اتصال اور صحت کا سوال تو درکنار خود متن کا اضطراب اور اس کا بے سند ہونا بالکل واضح ہے۔ ایسی حالت میں انجیل کی کسی روایت سے اگر ہم تعرض کر رہے ہیں تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہم اس کو صحیح تسلیم کر رہے ہیں بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے بغیر کسی بحث و تحقیق کے اس کی صحت تسلیم کر لیتے ہیں اور اس مفروضہ کو سامنے رکھ کر اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ممانعت حضرت مسیح علیہ السلام کے اس وعظ میں وارد ہے جو پہاڑی کے وعظ کے نام سے مشہور ہے اور جو متی کی انجیل میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ منقول ہوا ہے۔ مرقس اور یوحنا کی انجیلوں میں اس کے صرف فقرات ملتے ہیں۔ لوقا میں اس کا ایک مختصر حصہ ہے اس کے اختصار کی وجہ سے میں نے اسی کو اپنے اقتباس کے لیے پسند کیا ہے۔

اس خطبے پر جو شخص بھی غور کرے گا کہ وہ اس کے موقع و محل کی رعایت اور سیاق و سباق کی رہنمائی سے اس نتیجے پر

پہنچے گا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اس خطبے کے مخاطب جمہور نہیں ہیں اور انھوں نے اس کو تورات کی جگہ ایک مستقل شریعت کی حیثیت نہیں دینی چاہی تھی بلکہ خاص مصالح کی وجہ سے، جن کی تشریح آگے آئے گی۔ انھوں نے یہ پیغام صرف اپنے خاص شاگردوں کو دیا ہے۔ اس تخصیص کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس خطبہ میں ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب حضرت مسیح علیہ السلام کے خاص شاگرد اور پیرو ہی تھے۔ چنانچہ متی میں اس خطبے سے پہلے یہ عبارت ہے۔

"اور جب بیٹھ گیا تو اس کے شاگرد اس کے پاس آئے اور وہ اپنی زبان کھول کر ان کو یوں تعلیم دینے لگا"

اسی طرح لوقا میں اس خطبے سے پہلے مذکور ہے کہ انھوں نے ساری رات خدا سے دعا کرنے میں گزاری، پھر اپنے شاگردوں کو بلایا۔ ان میں سے بارہ کو منتخب کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے شاگردوں کی طرف نظر کر کے کہا۔ پھر خطبہ ان الفاظ میں شروع ہوتا ہے۔

"مبارک ہو تم جو غریب ہو کیونکہ خدا کی بادشاہی تمھاری ہے۔ مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو کیونکہ آسودہ ہو گے...... جب ابن آدم کے سبب سے لوگ تم سے عداوت رکھیں گے اور تمھیں خارج کر دیں گے اور لعن طعن کریں گے اور تمھارا نام بُرا جان کر کاٹ دیں گے تو تم مبارک ہو گے...... مگر افسوس تم پر جو دولت مند ہو کیونکہ تم اپنی تسلی پا چکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو کیونکہ بھوکے ہو گے۔ افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو کیونکہ ماتم کرو گے اور روو گے۔"

۲۔ اس خطبے میں جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ صرف غربا اور مساکین کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اس میں صرف قسم کھانے ہی سے نہیں روکا ہے بلکہ مال و متاع کی کثرت، فکر فردا، اور حفاظت نفس کے اہتمام سے بھی روکا ہے اور اس پر اس حد تک زور دیا ہے کہ جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر۔

۳۔ ان احکام میں بظاہر ایسی باتیں موجود ہیں جن سے تورات کے احکام کا نسخ لازم آتا ہے اور معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام یہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے احکام کے ذکر سے پہلے کھلے لفظوں میں اس شبہے کو دفع کر دیا ہے "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں"۔ (متی) پھر ایک دوسرے شبہے کو رفع کیا اور یہ واضح فرمایا کہ دنیا کو یک قلم ترک کر دینا اصل کمال نہیں ہے، یہ کمال اضافی ہے، ترک دنیا کی شکل میں انسان گناہوں سے جو پاکی حاصل کرتا ہے وہ امتحان سے فرار اختیار کر کے حاصل کرتا ہے اور یہ ترک دنیا کی سنت انھوں نے ان لوگوں کی تعلیم کے لیے اختیار کی ہے جو پورے کمال کے حصول سے عاجز ہیں، چنانچہ فرمایا۔ "شاگرد اپنے استاد سے بڑا نہیں بلکہ ہر ایک جب کامل ہوا تو اپنے استاد جیسا ہوگا" (لوقا) لیکن بعد کے مبتدعین اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سنت کی حیثیت محض ایک اضافی کمال کی سمجھی جائے، چنانچہ انھوں نے متی کی روایت میں اضافہ کر دیا کہ "پس چاہیے کہ تم کامل ہو جیسا کہ تمھارا آسمانی باپ کامل ہے۔" اور لوقا کی روایت میں اس جملے کے بجائے یہ الفاظ رکھ دیے گئے۔ "جیسا تمھارا باپ رحیم ہے تم بھی رحم دل ہو۔" حالانکہ ان الفاظ کی کراہت نہایت نمایاں ہے۔ کوئی بندہ اپنے پروردگار کے برابر نہیں ہو سکتا! مگر خدا کا شکر ہے کہ تحریف

کرنے والوں کی ان تمام دراندازیوں کے باوجود حق غالب رہا اور انجیل میں ایسی تصریحات ان کی خواہش کے خلاف باقی رہ گئیں۔ جن سے ایک طرف تو ہر طرح کے شائبہ شرک کی نفی ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کمال ایک اضافی کمال تھا جو فقرا کے لیے مخصوص ہے۔ چنانچہ متی باب ۱۹، ۱۶ میں ہے۔

"اور دیکھو ایک شخص نے پاس آکر کہا اے نیک استاد میں کون سی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ اس نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔ نیک تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر۔ اس نے کہا کون سے حکموں پر۔ یسوع نے کہا یہ کہ خون نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر، اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھ۔ اس جوان نے اس سے کہا کہ میں نے ان سب پر عمل کیا ہے۔ اب مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟ یسوع نے اس سے کہا اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا، اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا اور آکر میرے پیچھے ہولے۔ مگر وہ جوان یہ بات سن کر غمگین ہو کر چلا گیا کیونکہ بڑا مالدار تھا۔"

یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے سچ کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔"

اس میں حضرت مسیح علیہ السلام نے سائل کے سامنے واضح کر دیا کہ اس کے لیے حصول کمال کی راہ یہ ہے کہ ان کی پیروی کرے اور تمام اسباب تمدن سے دست کش ہو جائے اور یہ قطعی معلوم ہے کہ یہ کمال حقیقی کاملین کا کمال نہیں ہے بلکہ ایک اضافی کمال ہے کیونکہ حضرت ابراہیم، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، اور حضرت یوسف علیہم السلام سب صاحب مال و جاہ بھی تھے اور ساتھ ہی دینی کمال کی عظمت کے بھی مالک تھے۔ ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ یہ انبیائے عظام آسمان کی بادشاہی میں نہیں داخل ہوتے تھے۔ قانون کی منسوخی اور تورات و انجیل کے باہمی اختلاف کا جو شبہ پیدا ہوتا تھا ہماری اس تقریر سے وہ شبہ رفع ہو جاتا ہے۔

۴۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ان ارشادات کو اگر عام سمجھا جائے تو اس سے حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد علیہما السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کی سنتوں کی مخالفت لازم آتی ہے۔ ان بزرگ انبیاء نے خدا کی راہ میں جہاد کیے، اس کے لیے فوجیں جمع کیں مال اکٹھا کیا، اس کو اچھے مواقع پر صرف کیا اور کبھی دوسروں کی کمائی پر تکیہ نہیں کیا۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حصول کمال کے لیے ترک دنیا لازم ہے؟ یہ بات عیسائیوں کو بھی کھٹکی ہے۔ چنانچہ اس کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے متی کی انجیل میں ایسے اضافے کر دیے جس سے اصل کلام کی بالکل قلب ماہیت تبدیل ہو گئی ہے۔ متی کے الفاظ یہ ہیں "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں۔" "مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں"۔ حالانکہ ان تبدیلیوں کے بعد بھی بقیہ کلام کی روح میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل مخاطب مال کے فقرا و مساکین ہیں۔ روح و دل کے فقرا و مساکین نہیں ہیں۔ اس تحریف کی وجہ یہ ہوئی کہ ان لوگوں کے سامنے کلام کی صحیح تاویل واضح نہیں ہوئی۔ ہم آگے چل کر اس کی صحیح تاویل واضح کریں گے۔ بہرحال یہ قطعی ہے کہ یہ ارشادات ایک ایسی جماعت کے لیے مخصوص تھے جو اپنا دور پورا کر چکی یہ کسی کامل شریعت کا بیان نہیں تھا جو تہذیب و تمدن کی آخری منزلوں تک بنی نوع آدم کی رہنمائی کے لیے آئی ہو۔ یہ شرف

صرف شریعت اسلام کو حاصل ہے، جو ایک طرف تو جان و مال دونوں اللہ تعالیٰ کو سونپتی ہے، پھر اس کو طاعت الٰہی کی راہوں میں استعمال کرنے کی دعوت دیتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ۔ الآیۃ (توبہ - ۱۱۱) — اللہ نے مسلمانوں سے ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے۔

اس کی پوری تفصیل اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

اس تخصیص کے واضح ہو جانے کے بعد اب یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہو گیا کہ قسم کی مطلقاً ممانعت کی گئی ہے۔ ہم عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے اس کے جواز اور اس کی ضرورت کو ثابت کر چکے ہیں۔ ہم مسلمان تمام انبیائے کرام کی یکساں تعظیم کرتے ہیں اور ان کے کلام کی کسی ایسی تاویل پر راضی نہیں ہوتے جو عقل کے خلاف پڑے یا اس سے کوئی اخلاقی اصول منہدم ہو رہا ہو۔ آئندہ فصل میں ہم اس عظیم مصلحت کو روشنی میں لائیں گے جس کی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا تھا۔ لیکن اپنی اس بحث میں ہم اختصار کو ملحوظ رکھیں گے۔ اس کی تفصیل میں پڑنے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کے لیے جو حدود قرار دیے ہیں اس سے باہر نکل جائیں گے۔ اس کتاب کی پوری توضیح اس کے محل میں ملے گی۔

پیروانِ مسیح کے ساتھ ان احکام کے مخصوص ہونے کی حکمت

۲۰۔ مسیحی عقل و نقل کے درمیان عموماً تطبیق کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ ان کا عام خیال یہ ہے کہ دین عقل سے ایک ماوراء شے ہے تاہم ان کے اندر بھی کچھ ایسے فلسفی موجود ہیں جو دین کو عقلی الزامات سے بری ثابت کرنے کے بڑے دلدادہ ہیں۔ یہ فلسفی مسیحی علماء، عوام کے نزدیک زیادہ تر اپنی اس عقلیت کی وجہ سے بے دین سمجھے جاتے ہیں۔ مشہور فلسفی اسپنوزا، جو عبرانی زبان کا بھی ماہر ہے۔ ایسے ہی ملاحدہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ان احکام کے باب میں ہم اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے اس فلسفی کی رائے بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ یہ فلسفی، جہاں تک ان احکام کو ایک خاص امت اور ایک خاص حالت کے ساتھ مخصوص کرنے کا تعلق ہے، ہماری رائے سے متفق ہے۔ ساتھ ہی اس سے مسیحی اور مسلم اہل عقل کے نقطۂ نظر کا فرق بھی واضح ہوگا اور یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہماری تاویل دلیل کی وضاحت و قوت کے ماسوا مسیحی شریعت اور صاحبِ شریعت کی تعظیم کی روح سے بھی معمور ہے۔

اسپنوزا کا خیال یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیرو ظالم اور طاقت ور حکام کے محکوم تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے پیروؤں کو تذلل و اطاعت کے احکام دیے اور فرمایا کہ برائی کا مقابلہ نہ کرنا اور اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے پیش کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ اسپنوزا کے نزدیک یہ احکام کسی نیکی یا دینداری کے خیال پر مبنی نہیں تھے بلکہ اس کے خیال میں مسیحیوں کے اس وقت کے حالات و مصالح کے لحاظ سے یہی احکام ان کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔

اسپنوزا اتنا اعتراف کرتا ہے کہ یہ احکام ایک خاص امت کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن علم کی وسعت اور انبیاء کے صحیفوں اور ان کے حالات سے واقفیت کے باوجود اس تخصیص کی علت اس کی سمجھ میں نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے عقل کے پہلو کو تو ملحوظ

رکھا لیکن شریعت الٰہیہ کی تقدیس اور حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریین کے احترام کو وہ ملحوظ نہ رکھ سکا۔

ہمارا خیال اس سے بالکل الگ ہے۔ جس شخص نے بھی انجیل کے نسخوں کو غور و تامل کے ساتھ پڑھا ہے اس سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ حضرت مسیح علیہ السلام ایک آسمانی بادشاہت کی آمد کی بشارت دینے آئے تھے۔ یہ آسمانی بادشاہت کیا تھی؟ ایک خالص دینی اقتدار، جو پہلے یہود کو بخشا گیا تھا لیکن انھوں نے اس کو ضائع کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق، ہزاروں گردشوں کے بعد، اب پھر اس کے دوبارہ ظہور کے لیے منتظر تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو اس کے قرب کی بشارت سنائی اور متعدد ایسی تمثیلات سے اس کی حقیقت سمجھائی جو ٹھیک ٹھیک حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر منطبق ہوتی تھیں لیکن ان کی قوم کے عوام اس پر ایمان نہیں لائے اور علماء بھی چونکہ سخت دل اور سر و سامانِ دنیا کی طمع میں گرفتار ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے بھی ان کی مخالفت کی۔ بالآخر ان لوگوں سے مایوس ہو کر انھوں نے سادہ دل غریبوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو منتخب کیا، جو ہر قسم کے تعیشات اور سر و سامانِ دنیا کی آلائشوں سے پاک تھی اور اس کو دعوت دی کہ جب آسمانی بادشاہت کا ظہور ہو تو وہ اس میں داخل ہونے کے لیے تیار رہے۔ اس بادشاہت کے اندر ان کو مکمل شریعت کی نعمت بخشی جائے گی۔

اس مقصد عزیز کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ ان کو ایسی ہدایتیں دیں کہ وہ اپنے فقر و مسکنت کی زندگی پر قانع رہیں تاکہ دنیا کی رغبتیں اور لذتیں ان کے دل کی پاکی اور ان کے تقوے اور صبر کی اعلیٰ خصوصیات کو برباد نہ کر ڈالیں اور اللہ تعالےٰ اپنے قانون اور وعدے کے مطابق ان کو اپنی قبولیت سے سرفراز فرمائے۔ یہاں ہم نے اس کو بالاجمال ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل اس کے محل میں موجود ہے۔

ہم نے یہ تاویل اس لیے اختیار کی ہے کہ اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ایک طرف تو ایک عظیم الشان خوش خبری اور پیشین گوئی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور دوسری طرف عقل و نقل کے خلاف بھی نہیں پڑتا۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا تھا وہ مسیحیوں کے حالات پر ٹھیک ٹھیک منطبق ہو کے رہا۔ ان کے اندر ایک جماعت تو اپنے فقر و فاقے کی زندگی پر قانع رہی لیکن دوسری جماعت حضرت مسیح علیہ السلام کی نصیحتوں کو بھلا کر دنیاوی زندگی کی لذتوں میں مشغول ہو گئی اور پھر وہی ہوا جس کی حضرت مسیح علیہ السلام نے اس خطبے کے آغاز میں خبر دی تھی یعنی دنیا داروں نے غریبوں کو غربت و ناداری کے طعنے دیے اور ان کے قرب سے نفرت کرنے لگے۔ ان لوگوں کا گناہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنا تمام مال و متاع خدا کی راہ میں لٹا کر اپنے اوپر فقر و ناداری کی زندگی طاری کر لی تھی، توریت پر قائم تھے، خنزیر کو حرام سمجھتے تھے، ختنے کو ضروری خیال کرتے تھے، مسیح علیہ السلام کو اللہ نہیں بندہ سمجھتے تھے۔ انجیل کے صرف عبرانی نسخے کو مانتے تھے جس کو اوروں نے ضائع کر دیا تھا اور پال کے شدید مخالف تھے جس نے نصرانیت کو بالکل بدل ڈالا تھا، جس کی تعلیمات حواریین کی تعلیمات کے بالکل خلاف تھیں۔ جس کا دعویٰ تھا کہ اس نے مسیح علیہ السلام سے براہ راست رویا میں کسب فیض کیا ہے اس لیے اس کو مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے۔

جب یہ آسمانی بادشاہت، جس کی حضرت مسیح علیہ السلام نے بشارت دی تھی، حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

بعثت سے ظہور میں آئی تو ان فقراء کا بڑا حصہ اس میں داخل ہو گیا۔ لیکن دولت مندوں نے ان کی مخالفت کی اور وہ اس آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے محروم رہے۔

یہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے تورات، انجیل، قرآن مجید اور مسیحی تاریخ سے ہم اس پر دلائل رکھتے ہیں اس کی تفصیل ہماری تصنیفات ملکوت اللہ وغیرہ میں ملے گی جو اس سلسلے کے مباحث کے لیے مخصوص ہیں۔ یہاں تو محض سلسلۂ بحث سے مجبور ہو کر ہم اس گفتگو تک پہنچ گئے نہ اس سے یک قلم اغماض کر سکتے تھے اور نہ اس سے زیادہ تفصیل کے لیے یہ جگہ موزوں تھی۔

الغرض مسیح علیہ السلام کا قسم سے مطلقاً منع کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے تھا یہ حکم ان کے حالات کے لحاظ سے موزوں تھا۔ اگر ایک شخص نے تمام اسباب تمدن کو ترک کر دیا ہے اور اپنی تمام آرزوئیں اور ساری امیدیں اس نے ایک آنے والی آسمانی بادشاہت سے وابستہ کر رکھی ہیں تو وہ گالیاں سنے گا، طمانچے کھائے گا، شدائد جھیلے گا لیکن نہ تو انتقام لے گا، نہ کسی سے جھگڑے گا اور نہ زمین والوں سے کوئی معاملہ کرے گا، پھر ایسے شخص کو قسم کھانے کی کیا ضرورت پیش آئے گی! وہ یا تو ہاں کہے گا یا نہیں۔ قسم اور شہادت، دعویٰ اور ثبوت کا اس کی ولایت میں کیا ذکر! لیکن ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ ممانعت درحقیقت مقسم علیہ کے پہلو سے تھی، موقع کلام سے ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام دینی حقائق پر قسم کھانے سے کیسے روک سکتے تھے جب کہ انھوں نے خود حسب روایت یوحنا اپنی رسالت کی سچائی پر اللہ تعالیٰ کی شہادت پیش کی ہے اور معلوم ہے کہ قسم کی اصل حقیقت، شہادت ہی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں نصاریٰ کے رسولوں کا قول موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ حق کے لیے انھوں نے بھی قسمیں کھائیں۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے:

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّا اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ — کہا ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں اور

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۶-۱۷) — نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر کھلے طور پر پہنچا دینا۔

اس میں رَبُّنَا يَعْلَمُ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، قسم کے مفہوم میں ہے۔ یہ باتیں بالکل واضح ہیں۔ ان کے ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر جو فصلیں گزر چکی ہیں ان میں سارے شبہات کا جواب موجود ہے اور ہم نے ہر بحث میں عقل و نقل اور تورات و انجیل کی تطبیق کی بھی پوری کوشش کی ہے۔

بہر حال یہ جتنا کچھ بھی اختلاف ہے اصل حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ تکمیل و تفصیل اور افراط و تفریط کے درمیان نقطۂ عدل کی تعیین اور نفع و نقصان کے لحاظ سے احکام کے درمیان فرق و تمیز کے پہلو سے ہے۔ تم نے اوپر کی تفصیلات میں دیکھ لیا کہ اس فرق و امتیاز کو قسم کے باب میں قرآن حکیم نے کس باریک بینی کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے اور یہ کچھ قسم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس شریعت کاملہ نے اپنے تمام احکام و قوانین میں اس حقیقت کی پورے اہتمام کے ساتھ نگرانی کی ہے لیکن تمام احکام کی باریکیوں اور خوبیوں کی تفصیل کے لیے یہ موقع موزوں نہیں ہے۔ البتہ ایک بات یہاں ذکر کرنے کی ہے جو ہم نے اب تک بیان نہیں کی ہے وہ یہ کہ شریعت اسلام میں موقع کے اعتبار سے مختلف الفاظ قسم کے استعمال میں بھی ان کے مستحسن اور غیر مستحسن ہونے کے لحاظ سے فرق کیا گیا ہے۔ قسم کے مختلف مقاسم پر ہم نے جو بحث کی ہے اس کی تکمیل کے لیے اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز اس سے بلاغت قرآن کا ایک اور

گوشہ سامنے آئے گا اور عربی زبان سیکھنے کی بھی اس سے ترغیب ہوگی جس سے بے خبری بعض حالتوں میں آدمی کے دین کے لیے مضر ہوتی ہے۔

بلحاظ موقع مستحسن اور غیر مستحسن الفاظِ قسم کا فرق

۲۱- عربی کے اہل زبان اس نکتے کو جانتے ہیں کہ مترادف الفاظ میں باہمدگر فرق ہوتا ہے اور ہر ایک کے لیے ایک خاص مفہوم اور اس کے استعمال کے لیے ایک متعین حد ہے۔ قرآن مجید نے اپنے استعمالات میں اس فرق کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے جس کو صرف زبان کے ماہر ناقدین ہی سمجھ سکتے ہیں، مثلاً "ریاح" کا لفظ ہمیشہ فائدہ رسانی کے مواقع میں استعمال ہوا ہے اور "ریح" ضرر کے موقع کے لیے مخصوص ہے۔ یہی حال لفظ "امطار" کا ہے یہ عذاب کے مواقع میں استعمال ہوا ہے۔ اسی اصول کے مطابق مختلف الفاظ قسم کے استعمال میں بھی فرق کیا گیا ہے جس سے ان الفاظ کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔

اٹھارویں فصل میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ قسم کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن سے آدمی کے وقار اور شرف کو نقصان پہنچتا ہے۔ اب دیکھو قرآن نے اس حالت کو محض لفظ کے استعمال میں فرق کر کے کس طرح نمایاں کر دیا ہے۔ جو لوگ اپنی قسم سے اپنے تئیں ذلیل کر دیتے ہیں اور ایسے مواقع پر قسم کھاتے ہیں جن مواقع پر قسم کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، ان کی قسم کے لیے قرآن نے "حلف" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ براءت میں منافقین کی قسموں کا ذکر سات جگہ آیا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی قسمیں تمام تر دنائت نفس اور جھوٹے عذرات کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ اس سبب سے قرآن نے ہر جگہ اس کے لیے "حلف" کا لفظ استعمال کیا اور سارے قرآن میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے قسم کھانے والے کی دنائت اور دروغ بافی کی غمازی کر رہا ہے۔ زبان کے عام استعمالات میں بھی اس لفظ کی حیثیت یہی ہے۔ نابغہ نے نعمان بن منذر کے دربار میں انتہائی خوشامد اور تذلل کا اظہار کرنا چاہا تو کہا۔

حلفت فلم اترك لنفسك ريبة

وليس وراء الله للمرء مذهب

میں نے قسم کھائی اور تمھارے لیے بدگمانی کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑا اور خدا سے آگے تو آدمی کے لیے کوئی راہ ہے ہی نہیں۔

اس میں "حلف" کا لفظ استعمال کر کے اس نے انتہائی عاجزی اور خوشامد کا اظہار کر دیا ہے اور خوشامد میں نابغہ کا کوئی حریف ہے بھی نہیں، مشہور ہے کہ:

اشعرهم امرؤالقيس اذا ركب، والاعشىٰ اذا طرب وعنترة اذا غضب، والنابغة اذا رهب۔

سب سے بڑا شاعر امرؤالقیس ہے جب کہ سوار ہو۔ اعشیٰ ہے جب کہ مست ہو، عنترہ ہے جب کہ غضب ناک ہو نابغہ ہے جب کہ خوف زدہ ہو۔

اگر لفظ کی اس خصوصیت کو تم سمجھ گئے ہو تو مذہبی نقطۂ نظر سے اس کا فائدہ بھی سمجھ سکو گے۔ ہمارے عام مفسرین اور قرآن کے مترجمین اللہ تعالیٰ کے لیے "حلف" کا لفظ استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ بے تکلف کہہ دیں گے "حلف اللہ بکذا" (اللہ تعالیٰ نے اس بات کی قسم کھائی) حالانکہ اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

قسم کے بقیہ الفاظ کی خصوصیات سمجھنے کے لیے تمھیں ساتویں فصل پڑھنی چاہیے۔ وہاں ہم نے تمام الفاظ کی تشریح کی ہے۔

اس سے تم خود ہر ایک کی خصوصیت سمجھ سکو گے۔ یہاں ہم کو صرف اس قدر بتانا تھا کہ قسم بعض مواقع میں مذموم ہوتی ہے اور اسی موقع کے لحاظ سے قرآن نے اس کی مذمت کی ہے اور ایک خاص لفظ کے استعمال سے اس کو متعین بھی کر دیا ہے اور یہ قانون کی تفصیل اور وضاحت کا وہ درجہ ہے جو صرف شریعتِ اسلام کے لیے مخصوص ہے جیسا کہ فرمایا:-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل: ۸۹)

اور ہم نے تم پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا واضح بیان ہے اور ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے اطاعت کرنے والوں کے لیے۔

خاتمۂ کتاب

۲۲۔ اوپر کی فصلوں میں جو باتیں بیان ہوتی ہیں مسئلہ قسم سے ان کا تعلق محض اصولی ہے۔ آیاتِ قسم کی تفصیلی تاویلیں ہماری تفسیر میں اپنے اپنے موقع سے ملیں گی۔ تاہم ان فصلوں کے ضمن میں بھی ایسی باتیں آگئی ہیں جو قسموں کی اصل حقیقت اور ان کے صحیح رخ کو متعین کر دیتی ہیں مجھے یہ امر بھی واضح کر دینا چاہیے کہ اس کتاب میں اصلاً میرے پیشِ نظر بحثِ قسم کا صرف وہ پہلو رہا ہے جس پر معترضین کو شبہ ہے لیکن بحث کے اقتضاء سے مجھے بعض ایسے گوشوں میں بھی نکل جانا پڑا ہے جو بسط و تفصیل چاہتے ہیں۔ اس کے لیے لامحالہ مجھے کہیں کہیں عنانِ قلم ڈھیلی کرنی پڑی ہے لیکن جونہی اصل شبہ رفع ہوگیا ہے میں نے موضوعِ بحث سے ہٹ جانے کے اندیشے سے فوراً عنانِ قلم کھینچ لی ہے اور استقصائے بحث کا خیال نہیں کیا ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے یہ کتاب ایجاز و اطناب اور اجمال و تفصیل دونوں کی جامع ہوگئی ہے۔ ممکن ہے بعض عجلت پسند ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ پر کہیں غیر ضروری اختصار اور کہیں غیر ضروری تفصیل کا الزام لگائیں لیکن انھیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مسئلے کی خاص صورت نے مجھ کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ بایں ہمہ میں لغزشِ قلم سے بری ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔

واسأل الله العفو والمغفرة فانه ارحم الراحمين وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔